مقاصد قرآن

ترتیب وتزئین

ایس ایم نعمان عزیز خان

تالیف

ڈاکٹر نوشابہ کھوکھر

(گزشتہ سے پیوستہ)

ایاك نعبد و ایاك نستعین

"ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔"

نماز کی ہر رکعت میں سورۃ الفاتحۃ کا پڑھا جانا، نماز انفرادی ادا کر رہے ہوں یا جماعت میں نمائندگی "فرد" کے بجائے "اجتماعیت" کی بیان کرنے کا ڈھنگ اللہ کی تعلیم ہے۔ ہر نمازی "امت مسلمہ" کے ایک فرد کی حیثیت سے بارگاہ الہی میں ایک سائل بن کر التجا کرتا ہے۔

"ایاك نعبد"

"ہم (امت مسلمہ) صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔"

اس اخلاص میں مضمر عزم ذاتی خواہشات، پسند و ناپسند، دنیاوی دوستیاں عزتیں، مرتبے، خود پرستی کو حق تعالی کی خاطر روند ڈالنے کا جذبہ رکھتا ہے۔ اس عبادت کے اخلاص کے لیے امت محمدیہ کا یہ فرد اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتا۔

ایاك نستعین

"ہم صرف تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں۔"

ایسا کیوں نہ ہو جب کہ امت مسلمہ نے اپنے پیارے نبی سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن مجید اور احادیث نبویہ کے ذریعے اپنے معبود، خالق و مالک کا ایسا صاف و شفاف تعارف پایا ہے جسے دنیا کی کوئی تعلیم مکدر نہیں کر سکتی۔ دھندلا نہیں سکتی۔

عالی دماغ افراد اجتماعیت اور انسانیت کی بھلائی کی اعلی سوچ اور جذبوں سے پُر ہوتے ہیں جب کہ عامی ذہنیت کے حامل کو صرف اپنی ذات کی فکر ہلکان رکھتی ہے۔ "میں"، "مجھے"، میرا کی فکر اسے کنویں کا مینڈک بنا دیتی ہے۔

جس طرح اللہ رب العزت کے لیے لایعنی کام عبث ہیں اسی طرح اس کے محبوب خاتم الانبیاء والرسل سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ وہ محض اپنی نسلی نسبت کے باعث حسنین کریمین رضی اللہ عنہما

کو "سید اشباب اھل الجنۃ" قرار دیں۔ جب کہ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالی عنھا اور اپنی پھپھو رضی اللہ عنھا کو عمل صالح کی ترغیب دلائیں اور یوم حساب میں نسب کے باعث نہ بچنے کی ترہیب دلائیں۔

حضرت حسین رضی اللہ تعالی عنہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا:

حسین منی و انا من حسین

حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں۔

اپنے اندر حضرت حسین کے اس کردار کی گواہی رکھتا ہے جو انہیں محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور جنت کی سرداری کا اہل ثابت کرتا ہے۔

شوری اجتہاد کی ایک قسم اور اسلامی اجتماعیت کا مظہر ہے۔ شوری حکم خداوندی ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے میں "عدل"، مساوات، حریت فکر اور رائے کی آزادی جیسی اقدار پنپتی ہیں۔ دین اسلام کی عالمگیریت اور آفاقیت کا پتا چلتا ہے۔

سیدنا حسین رضی اللہ تعالی عنہ نے "نبی کریم کی تعلیم اور منہج مشاورت" سے روگردانی کے خلاف زبان اور عمل کی شہادت پیش کی۔ امت کی مصلحت کو پہچان کر اس کا حق ادا کیا۔ "امر بالمعروف و نھی عن المنکر" کے فرض کی ادائیگی میں راہ عزیمت چنی اور حالت نماز میں "ایاک نعبد وایاک نستعین" کی گواہی دی اور شہید ہو گئے۔

آپ رضی اللہ تعالی عنہ نے "امت مسلمہ" کے لیے شوری، عدل، مساوات، انسانی حقوق، حریت فکر، حریت رائے کے حصول اور فروغ کی اہمیت اپنی شہادت سے رقم کی۔ نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور قیامت تک کے لیے امر بالمعروف و نھی عن المنکر کی لازوال مثال اپنے قول و عمل سے دے کر حجت تمام کر دی ۔ اللہ تعالی امت مسلمہ کو اس قربانی اور اس کے ذریعے دی گئی تعلیم کو سیکھنے سکھانے اور اس پر عمل فرمانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

"اهدنا الصراط المستقیم "ہمیں سیدھی راہ دکھا"

قربان جائیے اپنے رب کی محبت پر۔ اس کی عنایات پر اس کی خیر خواہی، اس کے رحمانیت ور حمیت پر۔ ہر طرح کی مادی نعمتیں دان کر کے "دعا" کا ادب بھی سکھا دیا۔

"اھدنا" سکھا کر حجت تمام کر دی کہ بطور مخلوق اگرچہ تم محتاج ہو تاہم خوش قسمت ہو، شکر کرو تمہارا اللہ رب العالمین ہے۔ ہر احتیاج کے لیے دست دراز کرنے کے لیے وہی اصلی اور حقیقی جا ہے۔ زمین و آسمان کے خزانوں کا واحد مالک۔ اس کی ملکیت میں کوئی شراکت دار نہیں۔ اس کے اقتدار اور ملکیت کو کبھی زوال نہیں۔ خود زندہ ہے اور دوسروں کو قائم رکھنے والا ہے۔ کائنات کا ہر وجود اس کے مرہون منت ہے۔ وہی اول ہے اور وہی آخر ہے۔ وہ ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ دنیا مانگنے والے وجود کو دھتکارتی ہے اور اسے اپنے سامنے عاجزی سے جھکنے والوں اور دعائیں مانگنے والوں سے بہت پیار ہے۔

اس سے مانگیے۔ کیا چاہیے آپ کو؟

کھانا، بنگلہ، گاڑی، رشتے، بیٹیاں، بیٹے، عہدے، عزت، شہرت، سکون، محبت، دنیا کی ہر آسائش!!!

اس نے وحی کے ذریعے تعلیم دی۔ ہر جن و انس کو بتایا، سکھایا اور سمجھا دیا کہ تم اپنی ہر مانگ کے لیے اپنے "رازق اصلی" کی طرف رجوع کرو۔

کیا تم جانتے ہو کہ دعا میں مانگی جانے والی اہم ترین چیز جو تمہیں مجھ سے مانگنی ہے وہ کیا ہے؟

وہ "صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت" ہے۔

صراط مستقیم کو انسان محض اپنی عقل، ادراک اور شعور کے استعمال سے کھوج نہیں سکتا۔ وحی اسے پا لینے کا ذریعہ ہے۔ اسلامی شریعت کا مقصد اسی راہ مستقیم کی جامع و کامل عالمگیر رہنمائی فراہم کرنا ہے۔

انصاف کیجیے جب خود مانگنا سکھایا "ہمیں سیدھی راہ دکھا"۔ جو اس کا "حکم" مان جائے۔ قلب کو اللہ کی طرف متوجہ کر کے دعا کے لیے ہاتھ پھیلا دے۔ کیا اس کا دامن خالی رہے گا؟

ہمیں سیدھی راہ دکھا دے۔

ہمیں سیدھی راہ دکھادے۔

ہمیں سیدھی راہ دکھادے۔

وہ تو دل میں موجود احساسات کو بھی جانتا ہے تو پھر پانچ وقت نمازوں میں مانگی گئی اس دعا کو پورا کیوں نہیں کرتا؟

ذرا سوچیے

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

گلوبلائزیشن کے دور کی خاص دعا:

اهدنا الصراط المستقیم (سورۃالفاتحۃ)

"ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔"

موجودہ دنیا میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے دنیا بھر کے انسانوں کو قریب لانے ایک دوسرے کو جاننے کا وسیع موقع فراہم کیا ہے۔ دنیا بھر کے انسان ایک دوسرے کی تعلیمات کو جان رہے ہیں۔ متاثر ہو رہے ہیں۔ نوجوان نسل کی اکثریت اس شک میں مبتلا رہنے لگی ہے کہ جب سب انبیاء ورُسُل اللہ کے بھیجے ہوئے چنیدہ تھے تو ان میں سے کسی کی بھی پیروی کرلی جائے۔ ان کے لائے ہوئے کسی بھی مذہب پر چل لیا جائے. اس میں کیا حرج ہے؟ ہر راستہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف جانے والا تو ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے "صراط الذین انعمت علیھم" (ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا) یقیناً سب انبیاء ورسل اس آیت کا مصداق ہیں۔

پھر ان کی اتباع میں الجھن کیسی؟

بہت اہم بہت اہم بہت ہی اہم ہے

کہ

ان الجھے ہوئے سوالوں سے الجھی ہوئی نسل کو سلجھانے کے لیے کچھ کیا جائے۔

کیا آپ کو یہ مسائل محسوس ہو رہے ہیں؟

اگر ہاں تو آپ نے ان کو حل کرنے کے لیے کس راہ عمل کا انتخاب کیا ہے؟

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید
اللھم بارك علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انك حمید مجید

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ

"ہم کو سیدھے راستہ پر چلا۔"(سورۃ الفاتحۃ)

راستے یا منزلیں؟

کبھی سفر کیا ہے آپ نے؟

تو پھر۔۔۔۔

آپ کو "راستے" اچھے لگتے ہیں یا "منزلیں"؟؟؟

ننھا بچہ ہاتھ میں پینسل اور اخبار پکڑے "راستہ تلاش کریں" نامی گیم کو مکمل کرنے کے لیے کبھی کبھی ناکامی کی صورت میں منزل سے راستے کی جانب لکیر لگا کر کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

"اسے کامیابی چاہیے"۔

سیر و سیاحت کا شوق اکثر منزلوں سے زیادہ پُر فریب راستوں اور نظاروں سے دل لگا بیٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ منزل کی چاہ چھوڑ کر راستوں کا اسیر بن جاتا ہے۔

کبھی کبھی سفر ایک اذیت ہوتا ہے۔ کچے اونچے نیچے کٹے پھٹے راستے مسافر کو نگل جاتے ہیں۔ اسے منزل تک پہنچنا نصیب نہیں ہوتا۔

راستہ سیدھا پیچ و خم سے پاک۔ صاف ستھرا واضح نقشہ سفر ہاتھ میں۔ زاد راہ وافر۔ کامیاب ترین گائڈ ساتھ میں۔ کیا خیال ہے؟ کچھ اور درکار ہے؟

اچھاتو تم خود کو "مسافر" قرار دینے میں حق بجانب ہو؟ تم منزل کی جستجو کے قائل بھی نہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ پتا پوچھنے کو بھی شرک قرار دیتے ہو۔ زادِ راہ سے انکار کرتے ہو۔

آپ کیا ہیں؟ مسافر یا مقیم؟

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہدایت کی پکار:

نماز میں ہر ایک اللہ رحمن ور حیم کو اپنا واحد معبود مانتے ہوئے مدد کے لیے پکار تا ہے:

اھدنا الصراط المستقیم

"ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت دے"۔

"اھدنا" طلبِ ہدایت کا کلمہ اپنے اندر کئی لطیف معانی سموئے ہوئے ہے۔ اس کا تعلق انسان کو دیئے جانے والے جسم اور اس میں موجود قوتوں اور طاقتوں سے ہے۔ یہ طاقتیں بیک وقت لطیف بھی ہیں اور کثیف بھی۔ انسانی جسم میں موجود ایک ایک عضو اور اس کی کار کردگی، روح اور اس کی لطافت سب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی صنّاعی ہے۔ اسی کی عطا ہے۔

ہدایت کی تلاش کا سفر:

اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والی ایک ہدایت کو تمام ان پڑھ اور پڑھے لکھے انسان، امیر ہوں یا غریب دنیا کے کسی بھی خطے سے تعلق رکھتے ہوں کوئی بھی زبان بولتے ہوں کسی بھی مذہب پر عمل پیرا ہوں یا ملحد ہوں، سب اپنی روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں وہ "فطری الہام اور وجدان" ہے۔ ایک نوزائیدہ بچہ بھوک محسوس کرتا ہے اور دودھ کے لیے بلکتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے لمس اور اس سے حاصل ہونے والی غذا کی فطری پہچان رکھتا ہے۔ یہ وجدان یہ فطرت، اپنی ضرورت اور اس کو پورا کرنے کی سعی سب اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ودیعت کررکھی ہے۔ اس معاملے میں تمام انسانیت میں "مساوات" کا قانون من جانب اللہ ہے۔

انسان کے احساسات اور شعور کو پختہ ہونے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ کوئی بھی دو انسان بیک وقت ایک ہی عمر میں ایک طرح سے "محسوسات " میں کمال حاصل نہیں کرتے۔ چنانچہ جیسے جیسے اس کے محسوسات بلوغت کو پہنچتے ہیں ویسے ویسے وہ ہدایت کے درجوں میں بلندی کی طرف محو سفر ہوتا ہے۔

دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ "وجدان اور الہامی فطرت" کا مشاہدہ کریں تو انسان ان میں ہمیشہ " حقیقت " کو پا لیتا ہے۔ اس کے برعکس "محسوسات" میں تدریجا رفتہ رفتہ شعور کو حاصل کرتا رہتا ہے۔

اسی طرح اللہ تعالی کی طرف سے جسم انسانی میں ہدایت کی ایک اور شکل "عقل" کی عطا ہے۔ عقل کے استعمال سے انسان حواس کی غلطیوں اور ان کی وجوہات کو جانچتا ہے اور انہیں دور کرنے کے اقدامات کرتا ہے۔

"فطری الہام" ایک مخصوص دائرے تک انسان کی کامل "رہنمائی" کرتا ہے۔ اس کے بعد محسوسات کی دنیا ہے جو ہر روز آگے بڑھ رہی ہے۔ ایک روز میں جو چیز ہدایت لگتی ہے اگلے روز اپنے نقائص کو چھپانے سے قاصر ہوتی ہے۔ عقل اس پر منصفی کا کردار ادا کرتی ہے۔ ان سب عطاوں کے علاوہ بھی انسان کو اپنے خالق اور کائنات سے ربط کے لیے ایسی رہنمائی درکار ہے جسے اپنا کر اس کی زندگی کے تمام لمحات نفع حاصل کریں اور ضائع نہ ہو جائیں اور اسے ہمیشہ کی زندگی میں راحت و سکون میسر آجائے۔

<u>یاد رکھیے:</u>

"ایسی کامل ہدایت اور رہنمائی، ہمیشہ کی فلاح کسی مخلوق سے نہیں مل سکتی"۔

یہ کامل رہنمائی "خالق کی طرف سے ہدایت" ہے جو انبیاء و رسل کے ذریعے "دین" کی شکل میں انعام کی گئی ہے۔ دین پر عمل کر کے انسان محسوسات اور عقل کی کوتاہیوں، حیلوں اور بہانوں سے خود کو بچا کر " صراط مستقیم" پر چل سکتا ہے۔ "دین" دنیا کی ظلمتوں میں موجود "نور" ہے۔ جس کے بارے میں اللہ تبارک و تعالی کا فرمان ہے:

(واللّٰہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون)

"اللہ اپنے نور (دین) کو مکمل کرنے والا ہے چاہے کافر اسے ناپسندیدہ سمجھیں۔"

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

عبادت کیا ہے؟

سارادن گھر کچن میں کھانے پکانے گھر کی صفائی ستھرائی کپڑے دھونے اور برتن مانجنے میں گزر جاتا ہے۔اور اگر گھر کے کاموں سے فراغت نصیب ہو جائے تو مہمان نوازی تمام وقت لے اڑتی ہے۔کوئی عبادت کو وقت کیسے دے؟

جی عبادتوں کو وقت صرف امیر دے سکتے ہیں۔ ہمارے مولانے تو ہمیں اس حال میں رکھا ہوا ہے کہ دن بھر محنت مزدوری اور جگہ جگہ کی خاک چھانتے ہیں اور کپڑوں کی پاکی کا دھیان رکھنا قریبا ناممکن ہے تو پھر کوئی عبادت کیسے کرے؟

پڑھائی اس قدر مشکل ہے۔ کھانے پینے کا ہوش کرنا مشکل ہے۔اگر اچھی ڈگری نہ ملی تو دنیا میں گزارا مشکل ہو گا ۔اس سب کے ساتھ عبادت۔اللہ معاف کرنے والا ہے.

کوئی کچھ بھی کرلے میری صلاۃ الاوابین کی ادائیگی میں 30 منٹ لگ جاتے ہیں یہ وقت اگر میرے بزرگ ماں باپ بھی مجھے بلائیں تو میں نہیں دے سکتی۔ مہمان اپنی مرضی سے ائے تھے۔اب میں نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرون یا انہیں دیکھوں

بس بس خود کو زیادہ عابد وزاہد سمجھنے کی ضرورت نہیں۔پانچ وقت مسجد میں نماز ادا کرتا ہوں۔ایک مسلمان کی عبادت یہی ہے۔ قیامت کے دن پہلا سوال اسی کا ہو گا۔اب تجارت کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔ ہر بات گاہک کو سچ سچ بتادی جائے۔تو لیجیے جناب اپ نے گھر آئے رزق کو خود ہی لات مار دی۔

میں نے اپنے بچوں کو نماز روزہ کی پابندی سکھائی ہے۔ قرآن مجید کی روز تلاوت کرواتی ہوں۔ آج کل بچیاں فیشن کے مطابق چھوٹے ڈریسیز نہ پہنیں تو اچھے رشتے کہاں نصیب ہوتے ہیں۔

آپ سمجھتے ہیں کہ ہم سارادن لوگوں کی مدد اور تعاون میں ہی گزار دیں اور اپنی زندگی کے اصل مقصد عبادت کو فراموش کر دیں.

تقوی ایک مطلوب و پسندیدہ وصف

"ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ ۛ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ"،

"یہ (قرآن) وہ کتاب ہے جس (کے کلام اللہ ہونے) میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ (یہ) ہدایت ہے ان پرہیز گاروں کے لیے"(سورۃ البقرۃ:2)

قرآن مجید میں اللہ تبارک و تعالی نے جگہ جگہ "تلمیحات" کے ذریعے لمبے طویل قصوں،واقعات اور حقائق کو چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ تلمیح کے استعمال سے نہ صرف کلام مختصر ہو جاتا ہے بلکہ اس ایجاز سے بات کی تاثیر بھی بڑھ جاتی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں اللہ تعالی نے "ذلک الکتاب" سے قرآن مجید کی طرف اشارہ کیا

اور

"لاریب فیہ"

کہہ کر سابقہ آسمانی کتابوں کی اس وقت کی حالت زار اور ان میں موجود تحریف و تبدیلی کو بیان کر دیا ہے۔ خصوصا مدینہ منورہ میں یہود اور ان کی کتاب مقدس میں شامل کی جانے والی کھوٹ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ سابقہ تمام آسمانی کتابیں محفوظ نہ رہیں کیونکہ ان کی حفاظت کی ذمہ دار متعلقہ امتیں تھیں لیکن یہ کتاب یعنی قرآن مجید ایسی کتاب ہے جس میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا۔اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تبارک و تعالی نے خود لے رکھی ہے۔ فرمایا:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ

"حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اُتارا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

(سورۃ الحجر:9)

کتب سابقہ میں در آنے والی تبدیل و تحریف کے باعث اب یہ کتب اعلی کردار کی تعلیم و تربیت کے لیے نفع مند نہیں رہیں بلکہ اب قران مجید ہی اللہ تعالی کی نازل کردہ ایسی کتاب ہے جو اللہ تعالی کی طرف سے پسندیدہ اخلاق کی

تعمیل و تکمیل کرے گی اور اس پر عمل پیرا افراد تزکیہ اور صفت تقوی سے متصف ہو کر اللہ کے محبوبین میں شامل ہوں گے اور
ہر امت کو "تقوی" جیسی پسندیدہ صفت کی تعلیم دی گئی۔ اسلام کے تمام شعائر و عبادات اسی صفت کا تقاضا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

کیا صفت "تقوی" ایمان سے قبل بھی مطلوب ہے؟

دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ "ہدایت" حاصل کرنے کے لیے جن و انس میں پہلے سے تقوی کا ہونا لازمی صفت ہے۔

هدى للمتقين "ہدایت ہے متقین کے لیے۔"

اگر تقوی پہلے سے موجود ہو تو قرآن مجید میں نماز روزہ حج زکوۃ سے متعلقہ تمام آیات جو ان عبادات کے نتیجے میں تقوی کی خوبی کا حصول قرار دیتی ہیں ان سب کا اور سورۃ البقرۃ کی اس آیت کا آپس میں کیا ربط ہے؟

لگتا یوں ہے کہ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں جس تقوی کی بات کی گئی ہے وہ بعد والی آیاتِ تقوی سے مختلف ہے یا کم از کم تقوی کی ابتدائی کیفیت ہے جس میں انسان بالغ ہو جانے پر عقل کی صلاحیت کو استعمال کرتا ہے۔ اس کی دلیل اس آیت کے بعد والی آیات بتاتی ہیں۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوْنَ (3)

"جو بن دیکھے ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔"

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ(4)

"اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو اتارا گیا آپ پر، اور جو آپ سے پہلے اتارا گیا، اور آخرت پر بھی وہ یقین رکھتے ہیں۔"

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ(5)

"وہی لوگ اپنے رب کے راستہ پر ہیں، اور وہی نجات پانے والے ہیں۔"

قرآن مجید بتاتا ہے کہ

ایمان بالغیب تقاضا کرتا ہے کہ انسان بالغ اور عاقل ہو۔

نماز کی فرضیت تب ہوتی ہے جب انسان بالغ اور عاقل ہو۔ سن تمیز میں ہو یعنی دائیں اور بائیں کا فرق معلوم ہو۔

مال کو اللہ کی راہ میں زکوۃ کے فریضہ کی ادائگی میں اور نفلی صدقہ وخیرات میں تبھی مانا جائے گا جب خرچ کرنے والا بالغ اور عاقل ہو اور وہ اس بات کی سمجھ رکھتا ہو کہ مال کی اصل ملکیت اللہ تبارک وتعالی کی ہے اور مجھے دنیا میں اسے خرچ کرنے کا وقتی اختیار دیا گیا ہے۔

متقی ایک ایسا بالغ اور عاقل انسان ہے جو اپنی سمجھ بوجھ اور فہم سے کام لیتے ہوئے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب قرآن مجید کو من جانب اللہ وحی مانے اور وہ سلسلہ انزال وحی میں اس سے قبل نازل ہونے والی تمام کتب اور صحیفوں پر بھی ایمان رکھے۔

متقی ایک ایسا بالغ اور عاقل انسان ہے جو کائنات میں موجود زندگی کے ہر روپ کا مشاہدہ کرتے ہوئے جان لے کہ جو ایک دن پیدا ہوتا ہے اسے ایک دن ختم ہو جانا ہے۔اسی طرح یہ دنیا بھی ختم ہو جائے گی تو یہ اختتام یعنی آخرت ہو گی۔

مطلب ہدایت پر عمل پیرا ہونے کے لیے بنیادی صفت بالغ اور عاقل ہونا ہے۔اسلام سے قبل بھی بہت سے لوگ فطرتاً متقی ہو گزرے ہیں جنھوں نے اپنی عقل و فہم سے کام لیتے ہوئے برے اخلاق شراب اور جوئے کے استعمال اور بتوں کی عبادت سے خود کو دور رکھا۔ان کا ان برائیوں سے دوری اپنانا تقوی ہی کی ابتدائی شکل تھی۔

☆☆☆☆☆

سلسلہ ہائے رسالت ووحی کا اختتام

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (البقرہ:4)

"جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو آپ پر نازل ہوا اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے نازل کیا گیا اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہیں۔"

متقین کی چوتھی صفت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک تمام انبیاء ومرسلین کی نبوت ورسالت پر ایمان رکھنا ہے۔انہیں یقین رکھنا ہے کہ یہ اللہ تعالی کے چنیدہ بندگان باصفا ہیں ۔منصب نبوت و رسالت خالصتا من جانب اللہ ہے۔کوئی انسان خواہ کتنا ہی برگزیدہ، باعلم اور باکمال کیوں نہ ہو اپنی محنت سے نبی اور رسول نہیں بن سکتا۔

آیت میں نبی کریم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے خطاب کیا گیا ہے۔

(بماانزل الیک)

متقین اس پر ایمان لاتے ہیں جو تجھ پر نازل ہوا یعنی قران مجید اور سنت

(وماانزل من قبلک)

اور جو تجھ سے پہلے نازل کیا جاچکا یعنی تورات زبور انجیل صحف ابراھیم وموسی پر ایمان لاتے ہیں۔

"من قبلک" کے بعد "من بعدک" نہیں ہے:

قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ایمان کے لیے نبی کریم اور ان پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان کو موضوع بنایا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل آنے والے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی کو موجب ایمان بتایا لیکن مابعد آخرت کا ذکر کرکے معاملہ نبوت ورسالت ووحی کے اختتام کو واضح کردیا۔

☆☆☆☆☆

انکارِ نبوتِ محمدی = کُفر

ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَأَنذَرۡتَهُمۡ أَمۡ لَمۡ تُنذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُونَ۔البقرۃ:6

"جو لوگ کافر ہیں انہیں تم نصیحت کرو یا نہ کرو ان کے لیے برابر ہے۔وہ ایمان نہیں لانے کے۔"

کافر کون ہے؟

رات "کافر" ہے،اپنے اندھیروں میں ہر چیز چھپا دیتی ہے۔

سورج کی روشنی کو چھپا دینے والے بادل "کافر" ہیں۔

نعمت کو دوسروں سے چھپا دینا "کفر" ہے۔

ایمان باللہ کی دعوت آنے پر ایمان لانا واجب ہو گیا۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار "کفر" ہے۔

"کفر" کی حقیقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو مکمل طور پر مسترد کر دینا

یا

اس کے بعض حصے کا انکار کرنا ہے۔

کفار کو دعوت و تبلیغ دین اتمام حجت کے لیے ہے۔

ان آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش، اخلاص اور حسرت کی طرف اشارہ ہے جو باوجود کفار کے انکار کے جاری رہی مبادا وہ ایمان کی طرف پلٹ آئیں۔

آیت مبارکہ میں اگرچہ "الذین کفروا" کہا گیا ہے تاہم اس سے مراد ہر "کافر" نہیں۔ آیت کا مصداق مدینہ منورہ کے گرد و نواح میں بسنے والے یہودی احبار مثلاً حی بن اخطب اور کعب بن اشرف اور ان جیسے دوسرے لوگ مثلاً ابو جہل جو علم و معرفت رکھنے کے باوجود رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کے انکاری ہوئے۔ یہ منکرین نبوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل نازل ہونے والی وحی پر ایمان لاتے مگر آپ پر اترنے والی وحی کا انکار کرتے رہے۔ ایسے "کافر" جنہوں نے حق سننے اور علم رکھنے کے باوجود اس پر کان نہیں دھرا۔ رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حسد میں مبتلا ہوئے۔ اپنی فطرت کو آلودہ کر لیا۔

آیت مبارکہ میں ان مخصوص "کافروں" کے خاتمہ علی الکفر کی پیشینگوئی موجود ہے جو یوم بدر کو پوری ہو گئی۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی بھی دی ہے اور مستقبل سے آگاہ بھی کر دیا ہے۔ آپ انہیں ڈرائیں... خبردار کریں ...یا نہ کریں...ان کے لیے برابر ہے۔ انہیں ہدایت نصیب نہیں ہو گی۔

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ کے فریضے کی ادائیگی پر اجر ملے گا۔

☆☆☆☆☆

"قلب سماعت اور بصارت کا وظیفہ حق کی تلاش اور اس کی اطاعت ہے"۔

انذار لاحق ہو جانے والے شر اور فساد سے آگاہ کرنے کا عمل ہے یعنی ڈرانا۔
خطرے سے آگاہ کرنا اور نہ کرنا ایک جیسے عمل کیوں کر ہو سکتے ہیں؟
ایمان دل میں جگہ کیوں نہیں بناتا؟
یہ اور اس جیسے سوال اٹھانے والے متعجبین کو وجہ بتائی گئی ہے۔

خَتَمَ ٱللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمۡ وَعَلَىٰ سَمۡعِهِمۡۖ وَعَلَىٰٓ أَبۡصَٰرِهِمۡ غِشَٰوَةٞۖ وَلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٞ (سورۃالبقرۃ:7)

حق کا انکار اور گمراہی پر پسندیدگی نے کفار و منافقین کو اس قدر جکڑ رکھا تھا کہ انہوں نے اللہ تعالی کے دیئے ہوئے اعضاء و جوارح کا درست استعمال پس پشت ڈال دیا۔ دل کا کام عقل اور غور و فکر تھا جو انہوں نے نہ کیا۔ کانوں کا کام قران مجید اور حق کی تعلیمات بزبان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ سے سن کر اطاعت میں ڈھالنا تھا جس سے وہ گریزاں رہے۔ آنکھوں کا کام کائنات و انفس کے مشاہدے کے ذریعے اللہ سبحانہ و تعالی کی وحدانیت پر یقین کرنا تھا انہوں نے بصارت سے یہ قیمتی کام نہ لیا۔ جب ایسی بے اعتنائی بڑھتی جارہی تھی تو اللہ تعالی نے اپنے نبی مکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو آگاہ کر دیا کہ ان کی اس حالت میں تبدیلی واقع نہیں ہو گی۔ چنانچہ فرمایا:

اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

گویا شریعت کی اصطلاح میں "ختم" (مہر بندی) اور "غشاوت" (غفلت کے پردے) سے مراد گمراہ کے قلوب، سماعت اور بصارت کا "ہمیشہ کے لیے حق سے دوری اور گمراہی کی حالت پر بر قرار رہنا ہے"۔

☆☆☆☆☆

انتخاب آپ کا؟

رنگوں کی بات ہو، کپڑون کا انتخاب ہو، پلنگ سپاٹ کون سا ہو، اکثر دو چیزوں کے درمیان فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارا فیصلہ ہمیں عظیم خوشی سے ہمکنار کرتا ہے اور کبھی اذیت ناک دکھ سے۔ ہر صورت میں "فیصلہ "تو کرنا ہوتا ہے۔

اہم فیصلہ عقائد و نظریات کے باب میں ہوتا ہے۔ کبھی نادانی میں بعض سادہ مزاج لوگ اسے فلسفے کی پیچید گیاں جان کر غور و فکر نہیں کرتے اور کچھ عقائد و نظریات کا پرچار شروع کر دیتے ہیں جو سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات کے یکسر خلاف ہوتی ہیں اور بعض اوقات وہ نبوی تعلیمات کے بعض حصوں کے بر خلاف ہوتی ہیں۔ وہ اپنی سادگی میں اسے اسلام ہی جانتے ہیں۔

غور و فکر کیجیے اگر سفید رنگ میں ہلکے سے پیلے رنگ کی آمیزش کر دیں تو آپ اسے آف وائٹ کہتے ہیں کوئی دوسری رائے نہیں لیکن اگر آپ عقائد و نظریات میں نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی لائی ہوئی قطعی و یقینی تعلیمات میں ہلکی سی بھی کسی دوسرے عقائد کی آمیزش کر دیں تو پھر یہ تبدیل شدہ نظریات اور کچھ بھی کہلائے جاسکتے ہیں مگر "اسلام "نہیں۔ عقائد کے بارے میں اپ کے انتخاب کا فیصلہ یکسر آپ کی دنیا و آخرت بدل دیتا ہے۔

سورۃ الفاتحۃ کے اختتام پر اللہ سبحانہ و تعالی نے جن و انس کے لیے فیصلہ کر دیا ہے۔ راستے دو ہی ہیں یا تو صراط مستقیم ہدایت یافتگان کا راستہ یا اللہ کے دھتکارے ہوئے گمراہوں کا راستہ۔

ایک اور مقم پر اللہ تعالی نے اس معاملے کو یوں بیان فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّ مِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (التغابن:2)

"اسی نے تو تمہیں پیدا کیا ہے پھر کوئی تم میں سے کافر ہے اور کوئی مومن، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ دیکھ رہا ہے۔"

سورۃ البقرۃ کہ پہلی سات آیات میں پہلے کتاب اور مومنین کی بات ہوئی پھر کفار کی۔۔۔۔ لیکن اللہ کی رحمت نے گوارانہ کیا کہ اہل حق کو کوئی بھی اشتباہ رہے چنانچہ آیت نمبر آٹھ تا بیس تک " منافقین "کو موضوع گفتگو بنا کر مکمل وضاحت کر دی کہ ان کے ظاہر پر نہ جانا دراصل یہ کفار کے گروہ میں شامل ہیں۔

فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ (البقرۃ:8)

"اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے ہیں حالانکہ وہ ایمان والے نہیں ہیں۔"

☆☆☆☆☆

مصلحت و مفسدت

مصلحت و مفسدت کا ایک تصور وہ ہے جسے بے دین اور ملحد دانشوروں نے بیان کیا ہے۔ اس تصور میں خود پسندی ، مادیت پرستی، جاہ پرستی اور فرد واحد کے مفادات کو جماعت پر مقدم رکھنا صاف ظاہر نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دینی تصور مصلحت و مفسدت یکسر مختلف ہے۔ روحانیت اور مادیت کے امتزاج میں نہ صرف فرد بلکہ معاشرے کے لیے دنیا کی خیر و بہبود اس میں شامل ہے بلکہ مرنے کے بعد کی زندگی کے مصالح حاصل کرنے کے لیے بھی بھرپور نظام موجود ہے۔ وحی کی رہنمائی کے بغیر عقل مصلحت و مفسدت کا از خود فہم رکھ سکتی ہے یا نہیں؟ یہ سوال دانشوروں کا پسندیدہ سوال رہا ہے جس پر ہر زمانے میں طویل بحثیں رہی ہیں۔

اس حوالے سے مدینہ منورہ کے منافقین کے تاثرات ملاحظہ کیجیے۔ جب انہیں صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم اجمعین کی طرح اخلاص کے ساتھ زبان و قلب سے ایمان لانے کی دعوت دی گئی تو انہوں نے کیا جواب دیا:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ-اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ(سورۃ البقرۃ:13)

ترجمہ :

"اور جب ان سے کہا جائے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے ہیں تو کہتے ہیں کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لے آئیں جان لو وہی احمق ہیں مگر جانتے نہیں۔"

عربوں کے ہاں جس کی رائے بے وقعت ہو جسے نفع و نقصان کا پتا نہ ہو اور جسے مال کی حفاظت اور بڑھوتری کی صلاحیت نہ ہو سفیہ کہلاتا تھا۔

منافقین نے مادیت پرستی کو اپنا مطمع نظر بنا رکھا تھا۔ آخرت کی فکر ان کی نظروں سے محو تھی چنانچہ انہوں نے مخلص صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خاطر مال و متاع گھر بار رشتہ دار مکہ میں بے یار و مدد گار چھوڑ کر ہجرت کرنے کی وجہ سے انہیں "سفھاء" قرار دیا۔ یہ استہزاء نہیں تھا بلکہ ان منافقین دانشوروں کی رائے میں مہاجرین صائب الرائے نہ تھے۔ انہوں نے اپنا سب کچھ چھوڑ کر کم عقلی کا ثبوت دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

تجدید ایمان

دورخے اشخاص کسی بھی معاشرے اور اجتماعیت کے بنیادی ڈھانچے کو تہس نہس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ مفاد پرست ٹولہ دنیا کی ہوس میں اس قدر آگے چلا جاتا ہے کہ انہیں اپنے عقائد کے بگڑنے کی کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔ سورۃ البقرۃ کی ابتدائی آیات میں منافقین کا ذکر قیامت تک دیدہ عبرت نگاہ کے لیے تفصیل سے دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ

"اور جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے اور جب یہ اپنے شیطانوں کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو ان کے ساتھ مذاق کرتے ہیں۔"

ان آیات میں منافقین کا مومنین اور شیاطین کے ساتھ خطاب میں الفاظ کا چناو بہت سے اسرار کھول دیتا ہے۔ جب منافقین مسلمانوں سے ملاقات کرتے ہیں تو ان کے الفاظ میں ایک عمومیت ہے:

آمنا۔

ہم ایمان لائے۔

تاہم جب اپنے شیاطین یعنی کفر و منافقت کے سر کردہ افراد کعب بن اشرف مدینہ میں' ابو بردہ اسلمی بنو اسلم میں' ابو السوداء شام میں' عبد الدار جہینہ میں سے اور عوف بن مالک بنو اسد سے' وغیرہ

یعنی ہر گمراہ اور سرکش شیطان سے ملتے ہیں تو تاکید اور اصرار کے کلمات سے یقین دلاتے ہیں:

انا معکم۔

یقیناً ہم تمہارے ساتھ ہیں۔

یہاں الفاظ میں اصرار صاف نظر آتا ہے۔ گویا وہ اپنے ساتھیوں کو یقین دلاتے ہیں کہ مبادا مسلمانوں کے سامنے کہے گئے ہمارے ایمانی دعووں کو آپ سچ سمجھ بیٹھیں۔ حقیقت میں ہم آپ کے ساتھ ہیں اور ہم مسلمانوں کے ساتھ مذاق اور استہزاء کرتے ہیں۔

منافقین کے تصنع کی مثال یہ بھی دی جاتی ہے کہ انہیں ایسی مکاری و فریب بھی آتا ہے کہ ایک وقت میں وہ ایک آنکھ سے آنسو بہا سکتے ہیں جب کہ دوسری آنکھ بالکل خشک ہوتی ہے۔ مراد دورخے افراد ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ تعالی نے سزا ان کے عمل سے ہی مقرر کر دی ہے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ(البقرۃ:15)

"اللہ ان سے استہزاء کرتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے رہیں۔"

دنیا میں جابر ظالم سرکش اور دو موہنے افراد کی اکثریت مال و دولت کی ریل پیل اور بڑے بڑے عہدوں اور جاگیروں پر براجمان نظر آتے ہیں۔۔ منافقین کی محض دکھنے والی یہ خوشحالی اللہ تعالی کی طرف سے ان کی سرکشی میں دی جانے والی ڈھیل ہے جس میں وہ انہیں خود اندھا بہرا بنا کر بھٹکا رہا ہے اور وہ نادان اسے اپنی کامیابی جانتے ہیں۔

تحلیل خطاب

Discourse Analysis

وأُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ (سورة البقرة:16)

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی سو ان کی تجارت نے نفع نہ دیا اور ہدایت پانے والے نہ ہوئے۔"

آیت کے کلمات کا تحلیل و تجزیہ کریں تو حیرت انگیز معلومات ملتی ہیں۔ آیت میں "اشتروا" کا کلمہ بہت معنی خیز ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کل جہانوں کے خزانوں کا اکلوتا مالک جو ہر چیز سے بے نیاز ہے، خریدنے بیچنے کی گفتگو کرتا ہوا کیسا لگتا ہے؟

لوگوں میں امیری کا گراف جیسے جیسے اونچا جانا شروع ہوتا ہے ویسے ویسے کروفر اور غرور میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔پسندیدہ اشیاء محض انگلی کے اشاروں سے حاصل کرتے ہیں۔ مول تول کرنا شان کے لائق نہی رہتا۔ خریداری کرتے ہوئے فائدہ نقصان کی بات نہیں کرتے۔ایک طرح سے بے نیازی کی صفت کا اعلان عام کرتے پھرتے ہیں۔

یہ آیت کسی عام بندے کا "بیانیہ" نہیں ہے۔

احد الصمد، مالک الملک، قادر و مقتدر رب، اللہ تعالی "اشترو" "ربح" "تجارت" جیسے کلمات بیان کررہا ہے۔ یہ کلمات مخاطب کو منافقین کی دنیاپرستی، حب جاہ اور کثرت مال کی شدید خواہش سے آگاہ کررہے ہیں۔

" اصلاح اور ہدایت " وہ قیمت یا نقدی ہے جس کے عوض منافقین نے ضلالت و گمراہی خریدی۔ایسی تجارت کی جس میں صرف خسارہ ملا۔

آپ اس شخص کے بارے میں کیا فیصلہ دیں گے؟

جو "سعادت" دے کر "بدبختی" کا سودا کرلے۔

ایمان لائے پھر کفر اختیار کرلے۔

☆☆☆☆☆

ضد تکبر اور عناد کے اثرات

جب ضد اندر سے اٹھ جائے تو آواز آنے کے باوجود سنائی نہیں دیتا۔ حق سے مخاصمت ہو تو بہترین قوت گویائی رکھنے کے باوجود اقرار میں ایک لفظ نہیں نکلتا۔ حادثہ سامنے ہوتا ہے پر دکھائی نہیں دیتا۔

ہر ایک کو شکوہ ہے:

اولاد کہا نہیں سنتی۔

یاروں، محلے داروں اور رشتہ داروں کو ایک طویل وقت ساتھ گزارنے کے باوجود ہمارے حالات کی مخدوشی دکھائی نہیں دیتی۔

معاشرے میں غیبتوں کو سننے کے باوجود زبانیں مظلوموں کے دفاع اور حمایت میں ایک لفظ بولنے سے بھی قاصر رہتی ہیں۔

کون اپنے لیے مصیبت کا سامان کرے؟؟؟

کفار مکہ بعثت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "صادق" اور "امین" پکارتے۔ اپنی امانتیں ان کے پاس رکھوا کر بے فکر ہو جاتے۔ انہیں "شریف" مانتے۔ کریم ابن کریم مانتے۔ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

دعوت اسلام کا اعلان کرنا تھا کہ سب بدل گیا۔ اکثریت ضد اور ذاتی مفادات میں مبتلا ہو گئی۔

وہ صادق و امین شخصیت جو اپنی صداقت اور امانتداری کے باعث الگ تعارف رکھتا تھا۔ جس کی شرافت کی قسمیں کھاتے تھے۔ نبوت کا اعلان کرنا تھا کہ انہیں اس عالی نسب کی ہر خوبی دکھائی دینا بند ہو گئی۔ ہدایت کی آواز کو بغض وعناد نے روک دیا۔۔۔۔

وجہ؟

اگر اس کے کردار کی خوبیوں کا اقرار اب کر لیا تو سرداری گئی۔ حکومت گئی۔۔۔ سبھی کچھ گیا۔

اسی پر اللہ تبارک وتعالی نے ان کی حالت کے کبھی نہ بدلنے کی خبر ان الفاظ میں دی:

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ(سورۃالبقرۃ:18)

"وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں چنانچہ اب وہ واپس نہیں لوٹیں گے۔"

ان کفار میں سے چند نام یہ ہیں:

ابو جہل، ابو لہب، ولید بن مغیرہ اور عقبہ ابن ابی معیط۔ یہ سب اس آیت کے نزول کے وقت زندہ تھے۔ 2 ہجری میں غزوہ بدر میں اسی حالت بغض میں واصل جہنم ہوئے اور آیت میں موجود خبر کی حقانیت واضح ہو گئی۔

اس آیت اور اس کے بعد میں آنے والی دوسری مثال کا تعلق ان کفار سے خاص اور منافقین سے عام ہے۔ پہلی مثال میں ایک شخص کے آگ جلانے کا تذکرہ تھا۔ اشارہ صاحب بصارت و بصیرت نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دعوت اسلام کی طرف تھا۔ اس مثال میں کلمہ "مثلھم" منافقین کے لیے تھا جس کی بقیہ خبر صم بکم عمی کے اوصاف ہیں۔ دونوں ضمیروں میں فرق یاد رکھنا چاہیے۔

صلی اللہ علی محمد صلی اللہ علیہ وسلم

☆☆☆☆☆

ضد تکبر اور عناد کے اثرات:

جب ضد اندر سے اٹھ جائے تو آواز آنے کے باوجود سنائی نہیں دیتا۔ حق سے مخاصمت ہو تو بہترین قوت گویائی رکھنے کے باوجود اقرار میں ایک لفظ نہیں نکلتا۔ حادثہ سامنے ہوتا ہے پر دکھائی نہیں دیتا۔

ہر ایک کو شکوہ ہے:

اولاد کہا نہیں سنتی۔

یاروں، محلے داروں اور رشتہ داروں کو ایک طویل وقت ساتھ گزارنے کے باوجود ہمارے حالات کی مخدوشی دکھائی نہیں دیتی۔

معاشرے میں غیبتوں کو سننے کے باوجود زبانیں مظلوموں کے دفاع اور حمایت میں ایک لفظ بولنے سے بھی قاصر رہتی ہیں۔

کون اپنے لیے مصیبت کا سامان کرے؟؟؟

کفار مکہ بعثت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "صادق" اور "امین" پکارتے۔ اپنی امانتیں ان کے پاس رکھوا کر بے فکر ہو جاتے۔ انہیں "شریف" مانتے۔ کریم ابن کریم مانتے۔ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔

دعوت اسلام کا اعلان کرنا تھا کہ سب بدل گیا۔ اکثریت ضد اور ذاتی مفادات میں مبتلا ہو گئی۔

وہ صادق و امین شخصیت جو اپنی صداقت اور امانتداری کے باعث الگ تعارف رکھتا تھا۔ جس کی شرافت کی قسمیں کھاتے تھے۔ نبوت کا اعلان کرنا تھا کہ انہیں اس عالی نسب کی ہر خوبی دکھائی دینا بند ہو گئی۔ ہدایت کی آواز کو بغض و عناد نے روک دیا۔۔۔

وجہ؟

اگر اس کے کردار کی خوبیوں کا اقرار اب کر لیا تو سرداری گئی۔ حکومت گئی۔۔۔ سبھی کچھ گیا۔

اسی پر اللہ تبارک و تعالی نے ان کی حالت کے کبھی نہ بدلنے کی خبر ان الفاظ میں دی:

صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ(سورۃ البقرۃ:18)

"وہ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں چنانچہ اب وہ واپس نہیں لوٹیں گے۔"

ان کفار میں سے چند نام یہ ہیں:

ابو جہل، ابو لہب، ولید بن مغیرہ اور عقبہ ابن ابی معیط۔ یہ سب اس آیت کے نزول کے وقت زندہ تھے۔ 2 ہجری میں غزوہ بدر میں اسی حالت بغض میں واصل جہنم ہوئے اور آیت میں موجود خبر کی حقانیت واضح ہو گئی۔

اس آیت اور اس کے بعد میں آنے والی دوسری مثال کا تعلق ان کفار سے خاص اور منافقین سے عام ہے۔ پہلی مثال میں ایک شخص کے آگ جلانے کا تذکرہ تھا۔ اشارہ صاحب بصارت و بصیرت نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دعوت اسلام کی طرف تھا۔ اس مثال میں کلمہ "مثلھم" منافقین کے لیے تھا جس کی بقیہ خبر صم بکم عمی کے اوصاف ہیں۔ دونوں ضمیروں میں فرق یاد رکھنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

سورۃ البقرۃ کی اکیسویں آیت دنیائے انسانیت میں ایک عالمگیر اور آفاقی دعوت کا پیام:

يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ

" اے لوگو اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور ان لوگوں کو پیدا کیا جو تم سے پہلے گزرے ہیں تاکہ تم متقی بن جاؤ۔"

سچ یہ ہے کہ رسول اللہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے پہلے دنیا میں موجود تمام دعوتیں چاہے وہ انبیاء ومرسلین کی دینی دعوتیں تھیں یا صالحین کی مذہبی دعوتیں تھیں یا انسانی افکار و نظریات سب کے سب قومی، جغرافیائی، نسلی، لسانی وغیرہ وغیرہ جیسی تقسیمات میں محدود رہیں۔ اللہ تعالی نے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خاتم الانبیاء والرسل بنایا اور ان کو عالمگیر اور آفاقی رسالت و نبوت سے سرفراز کیا۔ اپ پر قرآن مجید نازل فرمایا جو سابقہ تمام کتب الہی کی محافظ و مھیمن بنا کر قیامت تک کے لیے محفوظ و مامون بنا کر اسلام کا نصاب قرار دیا۔ چونکہ رسول تمام انسانیت کا اور اس پر نازل ہونے والی کتاب تمام انسانیت کے لیے آخری اور مکمل ہدایت اس کا اظہار اس "خطاب" سے کیا گیا:

"یا ایھا الناس"

اے لوگو!

پچھلے تمام انبیاء ورسل کا خطاب تھا "اے میری قوم" یہ کلمات خود واضح کر دیتے ہیں کہ مخاطب مخصوص ہے۔ علاقہ زبان اور نسل کا اختصاص بھی موجود ہے اور دوسرے لوگ اس دعوت میں مدعو نہیں۔ لیکن اللہ تعالی نے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت ورسالت کے مقام کو اس آیت کریمہ سے واضح کر دیا: اے انسانو! غور کیجیے نہ عرب وعجم کی تفریق ہے، نہ طاقت ور و کمزور کی تقسیم، نہ امیر غریب کا فرق، نہ نام و نسب، نہ نسلی تفاخر، نہ عہدوں کے تفاوت کا دعوت پر اثر۔ مخاطب تمام انسانیت۔ جو اس وقت موجود، جو اس کے بعد آئے گی

قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اس دعوت کے مخاطبین۔ متقین مومنین کفار ملحدین۔۔۔جو کوئی بھی ہو یہ دعوت سب انسانوں کے لیے ہے۔

ان دو لفظوں کی ترکیب نے کئی حقائق کی نشاندہی کی جن تک بڑی بڑی طویل بحثیں نہ پہنچ سکیں:

۔تمام انسان برابر ہیں۔

۔سب اللہ تعالی کی مخلوق ہیں۔

۔رنگ نسل زبان جغرافیے مال و دولت اور عہدوں کے فرق سے کوئی عظیم اور عالی مرتبت نہیں۔

۔اللہ کی طاقت اقتدار اور تصرف کے سامنے سب مخلوق عاجز ہے۔

5۔امیر ہے یا غریب، کمزور ہے یا طاقت ور، سیاسی اثر و رسوخ والا ہے یا عام عوام، عقلمند ہے یا نا سمجھ، عالم ہے یا جاہل سب کو عبادت الہی کا فریضہ انجام دینا ہے۔

6۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو اس دین کی دعوت دی جس میں وہ خود اور تمام انسان اللہ رب العزت مالک و خالق احد و قھار کے بندے ہیں۔

7۔سب کا مقصد تخلیق اللہ تعالی کی پہچان اور اس کی عبادت ہے یعنی توحید۔

8۔توحید واحد عقیدہ ہے جو انسانوں میں "مساوات"، "حقوق انسانی" اور "حریت" کی تعلیم و تربیت درست خطوط پر استوار کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

معبود کی پہچان کی الوہی ہدایت

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (22)

"جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا پھر اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل نکالے، سو کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ حالانکہ تم جانتے بھی ہو۔"

اللہ رب العزت کا تعارف:

- ❖ مجھے اور سب انسانوں کو پیدا کرنے والا رب عبادت کا واحد حق دار ہے۔
- ❖ وہ ذات جس نے زمین کو انسانوں کے رہنے بسنے، چلنے پھرنے کے لیے سنوار کر "فرش" بنا دیا ہے وہی رب عبادت کا حق دار ہے۔
- ❖ وہ اللہ ہے جس نے آسمان کو ہمارے سروں پر چھت بنا کر رکھا ہے۔
- ❖ عبادت کا واحد حق دار اللہ تبارک و تعالیٰ ہے جس نے آسمان سے پانی کو بارش کی صورت برسایا۔ یہ پانی زمین میں پھلوں سے رزق بڑھانے کے لیے بہترین ہے۔
- ❖ یہ سب سوچو اور سمجھو۔ یہ سب جان لینے کے بعد اللہ کا شریک کسی کو بھی مت بناؤ۔

☆☆☆☆☆

علم اور تصور علم کا چیلنج

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ -وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (البقرہ:23)

ترجمہ :

"اور اگر تمہیں کچھ شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا تو اس جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب حمائتیوں کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔"

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ -اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ (البقرہ:24)

ترجمہ :

"پھر اگر نہ لا سکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہر گز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار رکھی ہے کافروں کے لیے۔"

قرآن مجید کا چیلنج موجودہ صدی میں "تصور علم" کے چیلنج کے طور پر نمایاں نظر آتا ہے۔دین اسلام علم کی تحریک ہے۔علوم کا سرچشمہ اللہ تبارک و تعالی کی ذات اور وہ تعلیمات ہیں جو اس نے اپنے بندے اور آخری رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے قیامت تک کے انسانوں کے لیے بھیجیں۔

دیگر مذاہب کے متبعین علم کو مذہب سے الگ اور مخالف سمجھتے ہیں۔اس رویے کو ابھارنے میں ان کے مذہبی پیشواوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے اپنی قوت اور اقتدار قائم کرنے اور لوگوں پر تسلط قائم کرنے کے لیے انہیں مذہبی کتب سے دور رکھا۔مبادا علم حاصل کر لیں اور ان پیشواوں کے سچ اور جھوٹ کھل جائیں۔تحریف و تبدل کو جان لیں۔چنانچہ ماسوائے اسلام کے معاشرے کے ہر فرد کو علم حاصل کرنے کی کھلی آزادی دنیا کے کسی مذہب میں نہیں دی گئی۔

اسلام میں "احسان" کی تعلیم اس روحانیت سے کوسوں دور ہے جو اپنے تئیں ایک فرد کو رب کی یاد میں اس طرح بٹھادے کہ وہ علم کی حصول کو لایعنی خیال کرے۔بے نیاز ہو کر دنیا میں "غیر نافع" اور "غیر متحرک" ہو کر ایک ایسے عالم میں پہنچ جائے کہ مرفوع القلم ہو جائے۔جب وہ مکلف ہی نہ رہا تو کس کام کا رہا؟

سوچیے

ارد گرد متحرک اور علم نافع کے شائقین انسان دنیا کا ہر کام چھوڑ کر، علم سے منہ موڑ کر اپنے خیال میں رب کے قریب ہو کر بیٹھ جائیں تو کیا ہو گا؟

مسلمان ہو اور علم کے حصول کی مذمت اور حوصلہ شکنی کرے؟

قرآن کی سورت کی مثل سورت بنانے کے چیلنج کو پورا نہ کرنے والوں کا انجام جہنم کی آگ ہے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں۔گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے بارے میں تردد اور شک کے گرفتار لوگ یقینا جہنم میں ہوں گے کیونکہ قرآن مجید کا کلام الہی ہونا اور کل انسانیت کا اس کے مقابلے سے عاجز ہونا نبی کریم کی رسالت کا ثبوت ہے۔

ھدایت اور گمراہی کے لیے مثال

عام طور پر "مثال کا بیان" ناسمجھ بچوں کی ضرورت سمجھا جاتا ہے چنانچہ بچپنے میں تعلیم و تربیت رسمی ہو یا غیر رسمی مثالیں ضرور بیان کی جاتی ہیں۔

سورۃ البقرۃ کے آغاز میں منافقین کے حوالے سے دو مثالیں ایسی ملیں جنہیں پڑھ کر آنکھوں کے سامنے ایک ماحول اور ایک منظر ابھر آتا ہے لیکن چوبیسویں آیت میں مثال کو بطور "ترجیح" کی صورت دے کر انسان کی نفسیات بہت لطیف پیرائے میں کھول کر رکھ دی گئی ہے۔

"انسان اپنی زبان کے پیچھے ہوتا ہے"

کیسے؟

چلیے غور کرتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَاؕ-فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْۚ-وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًاۘ-یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًاۙ-وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًاؕ-وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ (البقرہ:24)

ترجمہ:

"بیشک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کے لئے کیسی ہی چیز کا ذکر فرمائے مچھر ہو یا اس سے بڑھ کر۔ بہر حال ایمان والے تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور رہے کافر تو وہ کہتے ہیں، اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اللہ بہت سے لوگوں کو اس کے ذریعے گمراہ کرتا ہے اور بہت سے لوگوں کو ہدایت عطا فرماتا ہے اور وہ اس کے ذریعے صرف نافرمانوں ہی کو گمراہ کرتا ہے۔"

اللہ تبارک وتعالی کی ذات کے منکروں کے بیان کو جاننا اہم ہے:

(ماذااراد اللہ بھذا مثلا)

"اس مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟"

یہ جملہ نخوت سے بولا جائے تو "تکبر" کا مفہوم دیتا ہے۔

بے چارگی سے بولا جائے تو جاننا چاہیے کہ مفہوم "چھوٹے ذہن" میں آنے سے قاصر ہے۔

اللہ تبارک وتعالی کی عظمت کا مذاق اڑانے کے لیے "مچھر کی مثال کو حقیر" کہہ کر گویا سامعین کو گمراہ کرنے کے لیے خالق کے سامنے اپنی بے مائیگی اور عاجزی چھپانے کے لیے لفظوں کو سہارا لیا۔

اور بہت کچھ ۔۔۔

سمجھ دار مچھر کی تخلیق خالق کی صناعیت اور اپنی عاجزی کو اچھی طرح جانتے ہیں اور اللہ کی عظمت کے آگے سر جھکاتے ہیں۔ ایمان لاتے ہیں۔ صراط مستقیم کو پا جاتے ہیں۔ ھدایت یافتگان کہلاتے ہیں۔

ناسمجھ اللہ تبارک وتعالی کی دی ہوئی عقل، ہواس خمسہ، ادراک وجدان، وحی کسی چیز کا درست استعمال سیکھنے کی بجائے اپنے نفس کو خوش کرتے ہیں۔ حقائق سے چشم پوشی کے لیے زبان سے پردے ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ نتیجتاً صراط مستقیم کی بجائے معکوس سمت میں اور دائیں بائیں مڑ جاتے ہیں۔

آپ کی کیا رائے ہے؟

☆☆☆☆☆

فرشتے

بچپن میں فرشتوں پر گفتگو ہمارا پسندیدہ موضوع رہا۔ ایک دوسرے کی نیکیوں اور گناہوں کا حساب "کراما کاتبین" کے ساتھ ہم خود بھی کرتے رہے۔ ارے تم نے جھوٹ بول دیا ہے۔ اب گناہ لکھنے پر مامور فرشتہ کام پر

لگ گیا ہے۔ احساس ہوتے ہی استغفر اللہ کا ورد کر کر کے نیکیوں والے کو کام دیا جاتا اور اپنے تخیل میں یہ بھی دیکھتے کہ اب کسی اریزر سے گناہوں کو مٹا دیا گیا ہے۔

دعا پڑھ کر بیت الخلاء جایا کرو کیونکہ فرشتے گندگی اور ناپاکی کی جگہوں پر نہیں جاتے۔ چھوٹا سا دل افسردہ بھی ہوتا کہ یقینا فرشتے جہاں نہیں جاتے وہاں جنات اور شیاطین ہوں گے۔ دھڑ کا سا لگا رہتا۔

فجر کو آنکھ نہیں کھلتی تو یوں کرو سونے سے پہلے اللہ کے فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دیا کرو کہ مجھے فجر کے لیے جگا دینا۔ پھپھو جان کی بات پر جب جب عمل کیا۔ پورے وقت پر آنکھ کھل جاتی۔

امی جان بتاتیں کہ فرشتے نور سے بنے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ کی تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں اور اللہ تعالی کے کسی حکم کی ذرا بھی نافرمانی نہیں کرتے۔ بڑی حیرت ہوتی۔

غار حرا میں پہلی وحی اور ہمارے دل پسند فرشتے حضرت جبریل علیہ سلام کا آنا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھینچ بھینچ کر گلے لگانے کا واقعہ عجیب سی کیفیت پیدا کر دیتا۔

بچپن میں جو تعجب فرشتوں کے استعجابی سوال پر ہوا تھا آج بھی وہیں قائم ہے۔ جب فرشتے اللہ تعالی کی نافرمانی نہیں کرتے۔ جو اللہ کا حکم ہوتا ہے اس پر پورا پورا عمل کرتے ہیں تو پھر انہوں نے تخلیق آدم کے وقت اللہ تعالی کے اس عمل پر حیرت کا اظہار کیوں کیا؟ ایک مخلوق اپنے خالق پر اعتراض کیسے کر سکتی ہے؟ کیا مخلوق اپنے خالق کو مشورہ دے سکتی ہے؟

کیا فرشتے کے نورانی جسم میں بھی خون موجود ہوتا ہے؟ انہیں انسانوں کے اندر فساد اور قتل کرنے کی صلاحیت کا کیسے پتا چلا؟ اگر جنات پہلے سے زمین میں بستے اور فساد اور قتل کرتے تھے۔ تو کیا جنات کے اجسام میں بھی دوران خون کا نظام انسانوں کی طرح ہے جس پر فرشتوں نے قیاس کیا؟

کیا سوچنے سمجھنے اور اپنے ارادے کا اظہار اس مخلوق کے پاس بھی ہے جسے اللہ نے اختیار کی نعمت نہیں دی۔ قیاس کرنا ایک عقلی سرگرمی ہے۔ فرشتوں کو اس کی کیا ضرورت؟

چلیے اس آیت کی دوبارہ غور و فکر سے تلاوت کی جائے۔ یقینا اللہ اپنے فضل سے نوازے گا

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً-قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ-وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ-قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:30)

ترجمہ :

"اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایامیں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزیاں کرے اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے اور تیری پاکی بولتے ہیں فرمایامجھے معلوم ہے جو تم نہیں جانتے۔"

☆☆☆☆☆

ذکر آدم علیہ السلام اور ہماری لغزشیں

اپنے اردگرد ہر قسم کے لوگوں میں جن میں اعلی تعلیم یافتہ بھی ہیں اور سادہ ان پڑھ اور جاہل بھی اکثریت کو دیکھا ہے کہ ہر بات کا وبال آدم علیہ السلام کے سر ڈال کر خود کو طرم خان سمجھ لیتے ہیں۔

مثلا

ہائے ہائے ہمیشہ جنت کے مزے لوٹتے اگر آدم غلطی سے اس شجر ممنوعہ کا پھل نہ کھا لیتے۔ان کی غلطی کی سزا ہمیں کیوں؟

عورت ہے ہی فتنہ۔اسی کے باعث جنت سے نکالے گئے تھے۔دنیا بھی یہی برباد کرتی ہے۔

شعراء نے شعر کہہ ڈالے:

جرم آدم نے کیا اور نسل آدم کو سزا

کاٹتا ہوں زندگی بھر میں نے جو بویا نہیں

(منیر نیازی)

گویوں اور قوالوں نے ان غلط نظریات کو گھول گھول کر عوام کو پلا دیا ہے:

یہ برائی وہ بھلائی یہ جہنم وہ بہشت

اس الٹ پھیر میں فرماؤ تو کیا رکھا ہے

جرم آدم نے کیا اور سزا بیٹوں کو

عدل و انصاف کا معیار بھی کیا رکھا ہے

دے کر انسان کو دنیا میں خلافت اپنی

اک تماشا سا زمانے میں بنا رکھا ہے

(ناز خیالوی)

ٹیچنگ میتھڈ الوجی میں ایک ٹیچنگ میتھڈ ڈرل میتھڈ کہلاتا ہے۔اس میں کچھ کلمات یا عبارات کو بار بار اس طرح دہروایا جاتا ہے کہ ذہن نشین ہو جاتا ہے۔فن شاعری جمالیاتی ذوق کے نام پر ہماری حس جمالیات کو بھی گہنا دیا جاتا ہے۔

"میں گناہ گار ہوں کیوں کہ آدم کی اولاد ہوں"۔کیا ہمارے ایسے جملے بیباکی اور ایمانی کمزوری کو آشکارا نہیں کرتے؟

ذرا سوچیے اپنی والدہ اور والد کے بارے میں۔اگر کوئی شخص بار بار ان سے سرزد ہونے والی کسی غلطی کو بار بار دہرائے تو وہ آپ کو کتنا عزیز رہے گا۔اور یہاں بات ہم سب انسانوں کے باپ کی ہے جو اللہ تعالی کے نبی و رسول ہیں۔خلیفۃ اللہ ہیں۔انبیاء و رسل گناہوں سے پاک اللہ کے چنیدہ بندے ہوتے ہیں۔انہیں گنہ گار کہنے والا دائرہ اسلام میں نہیں رہتا۔

اللہ تعالی کا فرمان ہے:

وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا۪-وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (البقرہ:35)

"اور ہم نے فرمایا: اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور بغیر روک ٹوک کے جہاں تمہارا جی چاہے کھاؤ البتہ اس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ حد سے بڑھنے والوں میں شامل ہو جاؤ گے۔"

اللہ نے آدم و حوا کا اکرام کیا اور انہیں ایک متعین وقت کے لیے جنت میں رہنے بسنے اور کھانے پینے کی عزت بخشی تاہم ایک درخت کے قریب جانے سے بھی روک دیا۔ اور ایسا کرنے والے کو ظالمین میں شمار کیا۔

یہاں پھر ایک مخمصہ انسانی سوچ کو گھیر لیتا ہے ایمان والوں کے ایمان لٹنے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ الا یہ کہ جنہیں اللہ ہدایت دے وہ سالم ایمان کے ساتھ بچ نکلتے ہیں۔

جب آدم علیہ السلام کو تخلیق کرتے وقت اللہ تعالی نے انہیں زمین میں اپنا خلیفہ نامزد کیا تو زمین میں بھیجا جانا تو قبل از تخلیق طے تھا۔ یہ سزا نہیں ذمہ داری اور شرف تھا۔ اسی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے علم الاسماء کی تعلیم اللہ رب العزت نے آدم علیہ السلام کو دی۔

☆☆☆☆☆

کفر کیا ہے؟

پردہ ڈال دینا۔ چھپا دینا۔

سورۃ البقرۃ کی چوبیسویں آیت میں پہلی دفعہ "النار" کا تذکرہ ہوا۔ ایک ایسی آگ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور یہ سزا "کافروں" کے لیے تیار کی گئی ہے۔

انتالیسویں آیت میں اسی "النار" کی وعید ان لوگوں کے لیے ہے جنھوں نے حق پر پردے ڈالے۔ سچائی کو چھپایا۔ اللہ تعالی کی آیات کا انکار کیا۔ اس عذاب کی جانکاہی یہ ہے کہ یہ ہمیشگی کی صفت سے متصف ہے۔۔۔ جو کوئی اس جہنم میں جھونکا جائے گا وہ اس میں "ہمیشہ" رہے گا۔

وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (39)

اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا یہی لوگ آگ کے ساتھی ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

" اھبطوا" سے دنیا کی گھڑی کا وقت چلنا شروع ہوا۔ اس امتحان گاہ میں جو اچھائی برائی کمالی کمالی۔ موت کے ساتھ یا قیامت بپا ہوتے ہی وقت کی گنتی ختم۔ قیامت حساب کتاب کے بعد ہمیشہ کی جنت یا ہمیشہ کی دوزخ۔

سوال یہ ہے کہ ایمان والے شخص کے گناہوں کی سزا بھی ہمیشہ کی جہنم ہے؟؟؟

جس سے وہ کبھی باہر نہیں نکل سکے گا!!!

☆☆☆☆☆

بنی اسرائیل: اللہ کے بندے کی اولاد

"بنی اسرائیل" کے نام سے تذکرہ سے اللہ تعالیٰ کی حکمت کیا ہے؟

کیا یہ آیت صرف بنی اسرائیل کے ان لوگوں کو مخاطب کر رہی ہے جو نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عہد میں موجود تھے اور مدینہ منورہ میں آباد تھے یا آج کے زمانے میں اور آنے والے ہر دور کے وہ افراد جو "اولادِ یعقوب" ہونے کے دعوے دار ہوں، اس آیت کے مخاطبین ہیں؟

مدینہ میں تو یہودی قبائل آباد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے مذہب کی طرف نسبت نہیں دی بلکہ انہیں حضرت یعقوب کے لقب اسرائیل: اللہ کا بندہ کی اولاد کہہ کر "کیا" یاد دلایا ہے؟

اگلی آیت اس وعدے کی مزید وضاحت ہے اور اس کتاب پر ایمان لاو جو میں نے نازل کی ہے۔ تم لوگ اس کا انکار کرنے میں اولیت حاصل نہ کرو جب کہ یہ کتاب اس کی تصدیق کرنے والی ہے جو تمہارے پاس موجود ہے

وَ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْۤا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ۪-وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا٘-وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ (البقرہ:41)

"اور اس پر ایمان لاؤ جو میں نے نازل کی۔ وہ تمہارے پاس موجود کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے اور سب سے پہلے اس کا انکار کرنے والے نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑی قیمت وصول نہ کرو اور صرف مجھ ہی سے ڈرو۔"

اسی سورت میں 133 نمبر کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی وجہ خود ہی بتا دی اس لقب سے اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جب موت کے وقت حضرت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو یاد دہانی کے لیے پوچھا:

أَمْ كُنتُمْ شُهَدَاءَ إِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتُ إِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي قَالُوا نَعْبُدُ إِلَٰهَكَ وَإِلَٰهَ آبَائِكَ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِلَٰهًا وَاحِدًا وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ
(133)البقرہ

"کیا تم اس وقت موجود تھے جب موت یعقوب کے پاس آئی جب اس نے اپنے بیٹوں سے کہا میرے بعد کس کی عبادت کرو گے۔اس پر وہ کہنے لگے ہم آپ کے معبود اور اپ کے آباء ابراھیم اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو ایک ہی ہے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔"

اگر بنی اسرائیل کو یہ وعدہ یاد ہے تو اس کا مطلب ہے انہیں اس معبود کی ٹھیک پہچان ہے تو اب وہ اسی رب کے بھیجے ہوئے رسول اور اس پر نازل کی گئی کتاب کی تکذیب کیسے کر سکتے ہیں؟

ہاں یہ تو ہوا کہ اللہ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر ایمان لا کر دنیاوی عہدے اور مال چھن جانا تھا کہ سیادت دینی ختم ہو رہی تھی۔مال و دولت جاہ و منصب کی آرزو میں اپنی الہامی کتب کی آیات میں تحریف و تبدیلی کر کے تھوڑی قیمت کے عوض ایمان جیسی قیمتی چیز کو بیچنے سے اللہ تعالی منع کر رہا ہے اور فقط اللہ تعالی سے ہی ڈرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

Half-truth, Partial Truth:

دھوکہ دہی پر مبنی ایک ایسا بیانیہ جو عام طور پر آدھی سچائی اور بعض اوقات مکمل سچائی بھی لیے ہوتا ہے تاہم اس بیان سے سچائی کی بجائے جھوٹ کو بڑھاوا دینے کے لیے استعمال کیا جائے تو اسے "پارشیل ٹرتھ" یعنی "آدھی سچائی" کہتے ہیں۔

آدھی سچائی۔پارشیل ٹرتھ۔باتوں میں الجھانا۔بات سے بات نکالنا۔

کسی میں اچھائی ہو تو اسے چھپانا، برائی ہو تو اچھالنا اور کردار کشی کرنا۔ محض اس لیے کسی کا ذکر چھپانا مبادا سامنے آ گیا تو ہم پھیکے پڑ جائیں گے۔

نفس کو سمجھنا اور اس کی اصلاح کرنا جوکھوں کا کام ہے۔ہم دنیا بھر کو ہرا سکتے ہیں لیکن ہمارا نفس سبز باغ دکھا کر ہمیں ہرا دیتا ہے۔

بعض اوقات بظاہر بہت ملنسار،خوش اخلاق سماجی میل ملاپ اور ہر خوشی کو سیلیبریٹ کرنے والی شخصیات کس قدر "تلبیس" سے کام لیتی ہیں۔دوغلی ہوتی ہیں کہ انہیں خود بھی اس حقیقت کا پتا نہیں چلتا۔چلیے سادہ طور پر اسے اشتہاروں کی مثالوں سے سمجھیے:

اشتہاروں میں موجود آدھی سچائی۔

۔سیرپ کا نام ہے فل آف کیلشیم۔اس میں نیچے چھوٹا سا کر کے کیلشیم کی مقدار زیرو٪ موجود ہے

۔

24 گھنٹے دانتوں کو رکھے محفوظ۔مگر ٹوتھ پیسٹ کو ٹوائس اے ڈے استعمال کرنا کیا بتا رہا ہے؟

۔جب پیور جوس کے نام والے ڈبے کے انگریڈینٹس میں 27٪ جوس ہوتا ہے۔

۔جب ڈبل سنکر بار میں درمیان میں سے کاٹ کر دو پیسیز کیے گئے ہوتے ہیں اور ریپر پر snickers2× لکھا ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل اور تلبیس حق:

لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرہ:42)

"حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور جان بوجھ کر حق نہ چھپاؤ۔"

ایک نظر آیت پر ڈالیں۔سیدھا سادا بنی اسرائیل کو جھوٹ اور سچ ملانے کی حرکت پر اللہ تعالی کی طرف سے کی جانے والی تنبیہہ واضح ہوتی ہے۔جو اس قوم کا فرد نہیں ہے وہ اسے سمجھنے میں کوتاہی برت سکتا ہے۔

لیکن نہیں ذرا سوچیے !

یہ آیت ہر انسان کو ایک کلیہ فراہم کر رہی ہے۔

حق کی تلاش پر برانگیختہ کر رہی ہے۔

تحقیق کرنے پر ابھار رہی ہے۔

حق اور باطل کی پہچان سیکھنے کی ترغیب دے رہی ہے۔جب تم حق کو بطور حق پہچان نہیں سکتے تو اسے باطل سے الگ کیسے کروگے ؟

Discourse analysis

بھی یہی ہے۔ تلبیس اور تخلیط کو پہچان کر اصل مفہوم تک پہنچ جاو۔اس سب کے لیے "علم المعانی" کی شدھ بدھ اور ذوق بھی ضروری ہے۔

آپ دیکھیے قران مجید کس قدر متحرک تعلیم فراہم کرتا ہے۔ آپ کو غفلت کا شکار نہیں بناتا۔ آپ کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو زنگ نہیں لگنے دیتا تاہم یہ فوائد اسے ہی حاصل ہوں گے جو حق کا متلاشی ہو اور نفس کی اصلاح کے لیے راضی ہو۔اسکے لیے قرآن مجید کی آیات پر غور و فکر ضروری ہے۔

سماجی و معاشرتی تعلیم:

سماجی نقطہ نظر سے سمجھیں تو یہ آیت سماج اور معاشرے میں موجود انسانوں کی نفسانی و نفسیاتی کمزوریوں کی موجودگی اور ان سے اپنے عقائد کو بچا کر پاکیزہ رکھنے کی تربیت دے رہی ہے۔

بعض انسانوں میں یہ خرابی موجود ہوتی ہے کہ انہیں اپنا ذاتی مفاد اس قدر عزیز ہوتا ہے کہ وہ اسے بچانے کی خاطر اپنے خاندانوں، قبیلوں، قوموں کو قربان کر ڈالتے ہیں۔اسی روش پر چلتے ہوئے وہ ان مفادات کے تحفظ میں عقائد کو بھی قیمتا فروخت کر ڈالتے ہیں۔

مثالیں ہماری اپنی ذات اور ارد گرد میں بکھری پڑی ملیں گی۔ذرا غور و فکر کیجیے۔

کیا آپ کو کوئی ایسی مثال ملی؟شئیر کیجیے

☆☆☆☆☆

نعمت کا شکرانہ، قبولِ نعمت پھر اظہارِ نعمت ہے

زندگی میں ایسے کئی مواقع آتے ہیں جب نعمتوں کی فراوانی انسان کے عجز کو روند کر اس میں فرعونیت بھر دیتی ہے۔ نعمت کی قدر نہیں رہتی۔ بغاوت اور سرکشی مزاج کا حصہ بننے لگتا ہے۔ وہ تمام لوگ جو ان نعمتوں سے محروم ہوتے ہیں کیڑوں مکوڑوں کی مانند لگنے لگتے ہیں اور اپنا آپ اتنا خاص لگتا ہے جیسے یہ نعمتیں رب کی عطانہ ہوں بلکہ انسان کی ذاتی ملکیت ہوں۔ جو چھن نہیں سکتیں۔

نعمتوں کی قدر دانی کے لیے اللہ تعالی نے فرمایا:

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (البقرہ:47)

"اے اولادِ یعقوب یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور یہ کہ اس سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی۔"

اس آیت میں دوسری مرتبہ بنی اسرائیل کو یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو بنی اسرائیل یعنی اللہ کے بندے کے بیٹو کے الفاظ سے پکارنے میں بڑی حکمت ہے اور اس میں ایک احتیاط پردہ داری اور محبت و شفقت کا اظہار ہے۔ صاحب عقل و بصیرت تو اس طرز تخاطب پر ہی اپنی قابلیت اور مقام کی حقیقت سے آشنائی کو درست استعمال کر کے اپنے خالق و مالک کی رضامندی میں راضی ہو جائیں گے اور اطاعت رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم سے نعمت اور فضیلت کا شکرانہ ادا کریں گے۔

ہم سب کے پاس ماں باپ اولاد رشتے دار، مال، عہدے اثاثے جو کچھ بھی موجود ہے، وہ اللہ رب العزت کی دی ہوئی نعمتیں ہیں یا ہماری ذاتی مِلک؟

ان سب کی یاد گیری اور شکرانہ کس طرح ادا ہو رہا ہے؟

کیا یہ سب سوچنے کے لیے ہمارے پاس وقت ہے؟

☆☆☆☆☆

نجات

زندگی میں مختلف انواع و اقسام کے عذاب انسانی زندگی کو درپیش رہتے ہیں۔کچھ عذاب ذہنی اور روحانی اور کچھ جسمانی ہوتے ہیں اور بعض میں روح و جسم دونوں ہی گھائل ہو جاتے ہیں۔

نجات دہندہ اور مکتی کی تلاش میں بہت سے نظریات جنم لیتے رہے ہیں۔حقانیت کی تلاش میں عقائد کی چھان بین کا تسلسل جاری ہے۔حضرت یعقوب کی اولاد کو نعمتوں میں سے نجات کی یاد دہانی کراتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا:

وَاِذْ نَجَّيۡنٰكُمۡ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ يَسُوۡمُوۡنَكُمۡ سُوۡٓءَ الۡعَذَابِ يُذَبِّحُوۡنَ اَبۡنَآءَكُمۡ وَيَسۡتَحۡيُوۡنَ نِسَآءَكُمۡ ‌ؕ وَفِىۡ ذٰلِكُمۡ بَلَاۤءٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَظِيۡمٌ(البقرہ:49)

"اور جب ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی، وہ تمہیں بری طرح عذاب دیا کرتے تھے، تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے، اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہاری بڑی آزمائش تھی۔"

آل فرعون کی طرف سے پہنچنے والا عذاب جسمانی و نفسیاتی تھا۔بیٹے قتل ہو جانے سے پہنچنے والا دکھ اور عذاب طویل مدت تک اثر انداز ہونے والا تھا۔اسی لیے اللہ تعالی نے اسے "سوءالعذاب"کا نام دیا۔یہاں اللہ تعالی نے غیر محسوس انداز سے گتھی کھول دیا ہے کہ بظاہر یہ آل فرعون کی طرف سے دیا جانے والا عذاب تھا اور حقیقت میں رب کی طرف سے لی جانے والی بڑی آزمائش تھی۔اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کو اس آزمائش سے نکالا اور اس نعمت کے تذکرہ میں فرمایا:

وَ اِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَ اَغۡرَقۡنَآ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَ اَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ(البقرہ:50)

"اور (یاد کرو) جب ہم نے تمہارے لئے دریا کو پھاڑ دیا تو ہم نے تمہیں بچالیا اور فرعونیوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے غرق کر دیا۔"

آزمائش عقائد کی ہو یا دیگر دینی معاملات میں ہو سیاسی معاشی یا معاشرتی ہو نجات دینے والا اللہ سبحانہ و تعالی خود ہے۔تاہم عالم اسباب میں تعلیمات کے فروغ کے لیے اپنے نمائندہ و چنیدہ پیغمبروں اور رسولوں کے ذریعے اس نے

انسانیت کو گمراہی سے بچانے کا بہترین انتظام کیا۔ یہ سلسلہ آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور رسول اللہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اختتام پذیر ہوا۔

ان آیات کو پڑھ کر شعور بیدار ہوتا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی اپنی زندگی میں کسی مشکل اور پھر اس سے ملنے والی نجات پر غور کرے۔

کیا وہ نجات دہندہ اللہ خود نہ تھا؟

یا اس کے سوا کوئی اور بھی تھا؟

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆☆☆☆☆

چالیس راتیں

چالیس کے عدد کی حکمتیں اسرار اور خوبیاں زندگی کے ہر شعبہ کے ماہرین کے ہاں خاص اہمیت کی حامل نظر آتی ہیں۔

وَ اِذۡ وٰعَدۡنَا مُوۡسٰۤی اَرۡبَعِیۡنَ لَیۡلَۃً ثُمَّ اتَّخَذۡتُمُ الۡعِجۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِہٖ وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ(البقرہ:51)

"اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ سے چالیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر اس کے بعد تم نے گوسالہ کو (بغرض پرستش) اختیار کیا اور تم ظالم بن گئے۔"

اولاد یعقوب کو چالیس راتیں یاد دلانا، ان کی حق شناسی کو پھر سے مہمیز کرنے کی ایک راہ لگتی ہے۔

کیا آپ سے کبھی غلط فیصلے ہوئے؟

کیا کبھی آپ نے اپنی زندگی کا قیمتی وقت کسی دوسرے کی اندھی تقلید میں رگید ڈالا؟ باوجود اس کے کہ رب کا وسیلہ، حق شناس آپ کے ساتھ ساتھ رہا لیکن اپنی ہوا و ہوس میں اسے نہ پہچانا؟

غرور کس بات کا؟ فخر کس بات کا؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد، حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد، دنیا کی امامت اور ہدایت کے لیے چنی گئی قوم کے افراد کی سینکڑوں سال کی تعلیم توحید "چالیس راتوں" میں غارت ہو گئی۔

قصور سامری کے بچھڑا بنا کر انہیں اس کی عبادت کی دعوت دینے کا تھا؟

قصور حضرت موسی علیہ السلام کا انہیں محض چالیس راتیں وہ بھی اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کے ذمے لگا کر طور جانے کا تھا؟

قصور اندھی تقلید کا تھا؟ شعبدہ بازیوں سے متاثر ہونے کا تھا؟

۔۔۔۔کیا تھا؟

ٹھوکر کوئی بھی کھا سکتا ہے۔ ضرورت حق و باطل میں فرق کرنے کی تمیز کو صیقل رکھنا ہے ورنہ گمراہی و ضلال مقدر۔

☆☆☆☆☆

معافی_احسان مندی

کون سی غلطیاں معاف کی جانی چاہییں؟

دعوت میں پورے خاندان کو بلایا صرف مجھے نظر انداز کیا۔ اس غلطی کا ازالہ تو کرنا پڑے گا۔

مجھ سے آگے نکلنے کی غلطی۔ دماغ درست کرنا پڑے گا۔

کانٹریکٹ کر کے عہد شکنی کی۔ تاوان اور دفعات بھگتنی تو پڑے گی۔

جی ساری زندگی میں جانے انجانے میں دوسروں کی غلطیاں گنتے چلے جاتے ہیں معاف کرنے کی ہمت بدلہ لینے کی سوچ کے وزن کے نیچے کہیں دب جاتی ہے۔ اٹھ نہیں پاتی ہے۔

انسان انسانوں سے عفو و درگزر نہیں کر پاتے ادھر ہمارے خالق و مالک کی عظمت و بڑائی دیکھیے۔

بنی اسرائیل پر پے درپے نعمتوں اور احسانات کے انبار لگادیے۔ تسلسل سے ہدایت کے لیے انبیاء ورسل ساتھ رہے۔بس حضرت موسی علیہ السلام کا چالیس راتوں کے لیے ان سے دور رہنا تھا کہ توحید کے اسباق بھولے اور ایک بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے۔

اللہ تعالی معبود برحق کی جگہ کسی اور کی عبادت کرنا شرک نہیں تو اور کیا ہے؟

اس پر بھی خالق ارض وسماء کہتا ہے :

ثُمَّ عَفَوۡنَا عَنكُم مِّنۢ بَعۡدِ ذَٰلِكَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُونَ(البقرۃ:52)

"پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معاف کر دیا کہ شاید تم شکر گزار بن جاوَ."

اللہ تعالی نے قوم بنی اسرائیل کے مشرکانہ اطوار کو بھی معاف کر دیا۔درگزر کیا اس پر اللہ رب العزت کی شکر گزاری،احسان مندی ان پر واجب تھی۔

یوں اولاد یعقوب "پدرم سلطان بود" کا نعرہ لگا کر خود کو صالح نہیں گردان سکتی۔" اپنے لیے نیک اعمال خود کرنا ہوتے ہیں"۔

"معافی ملنے پر شکر گزاری مطلوب عمل ہے"۔

کیا ہم "شکر گزاری" کا رویہ اپناتے ہیں یا تکبر میں مبتلا رہتے ہیں۔ تکبر انسان کے لیے روا نہیں۔

☆☆☆☆☆

یادداشت___تم خاص ہو۔

یادداشت کیسے کام کرتی ہے؟لائبریری میں ایک موضوع کی کتابیں ایک شیلف میں اکٹھی کر دی جاتی ہیں۔اسی طرح ذہن میں یاددوں کی بھی الگ الگ شیلف ہوتی ہیں۔ہر یاد اپنے موضوع سے متعلقہ شیلف میں پڑی ہوتی ہے۔جونہی ان سے متعلقہ بات چلتی ہے تو یکے بعد دیگرے یاد کی متعلقہ الماریاں کھلتی چلی جاتی ہیں۔

بنی اسرائیل کو بھی توحید اور شرک کی یادداشتوں کے ساتھ ایک اور یاد دلائی جارہی ہی۔ حضرت موسی علیہ السلام کا طور پر چالیس راتیں گزارنے اور "الکتاب" اور "الفرقان" عطاہونا تاکہ بنی اسرائیل ہدایت حاصل کر سکیں۔

وَ اِذۡ اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡکِتٰبَ وَ الۡفُرۡقَانَ لَعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ(البقرۃ:53)"اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ہم نے موسیٰ کو (توریت) کتاب اور فرقان (حق و باطل میں امتیاز کرنے والا قانون) عطا کیا تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔"

خوبصورت بات یہ ہے کہ موسی علیہ السلام کو الکتاب کی تعلیمات، بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے دی گئیں۔
آیت میں نزول وحی اور اس کی حکمت دونوں کی بات کی گئی ہے۔
یعنی خالق نے تمہارے ظلم پر تمہیں بھٹکنے کو نہیں چھوڑا۔ تم سے ناامید نہیں ہوا اور تمہاری ہدایت کے لیے نبی اور کتاب مخصوص کی۔ یعنی یاد رکھو "تم اپنے معبود کے لیے کس قدر خاص رہے ہو"۔

☆☆☆☆☆

انسان سب سے بڑا ظلم کس کے ساتھ کرتا ہے؟

والدین کے ساتھ!

اولاد کے ساتھ!

رشتہ داروں کے ساتھ!

آس پڑوس اور علاقے والوں کے ساتھ!

دوستوں کے ساتھ!

نہیں نہیں۔

انسان سب سے بڑا ظلم اپنی جان پر کرتا ہے جب وہ خود کو "خالق" کی بندگی کی بجائے "مخلوق" کی مخلوق گردانتا ہے۔ وہ مخلوق کو اپنا "مالک" جان کر ظلم عظیم میں مبتلا ہوتا ہے۔
بنی اسرائیل: اللہ کے بندے یعقوب علیہ السلام کی اولاد نے حضرت موسی علیہ السلام کی غیر موجودگی میں بچھڑے کی پوجا سے دل بہلانا شروع کر دیا۔ توحید کا سبق قصداً بھلا دیا۔ انہیں اس ظلم اور اس پر توبہ کی یاددہانی اللہ تعالیٰ نے یوں کرائی:

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُوا إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوا أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

(البقرۃ:54)

"جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم بچھڑے کو معبود بنا کر تم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ اب تم اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع کرو، اپنے آپ کو آپس میں قتل کرو، تمہاری بہتری اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسی میں ہے، تو اس نے تمہاری توبہ قبول کی، وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم و کرم کرنے والا ہے۔"

اس جرم سے رہائی اور توبہ کے لیے ایک سزا اللہ نے مقرر کی وہ بنی اسرائیل کا آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرنا تھا۔

انہوں نے جب اس حکم پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی عملی توبہ کو قبولیت بخشی۔ ان پر رحم فرمایا۔

اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہر فرد کو دراصل اپنی انا اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو قتل کر کے اللہ توّاب کی رحمت کی جستجو کرنا ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کا بچھڑے کو پوجنا دراصل اپنی خواہشات اور ہوی و ہوس کو معبود بنانا ہے۔ اس میں تقریباً آج کا ہر فرد مبتلا ہے۔ اللہ ہمیں اس ظلم سے بچائے۔ اپنی طرف رجوع کی توفیق دے۔ ہمیں ہمارے نفس کے حوالے نہ کرے۔ ہم پر رحم کرے۔ آمین

☆☆☆☆☆

کانٹریکٹ (میثاق) پر عمل کے تقاضے

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ (63)

"اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر کوہِ طور بلند کیا، جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اسے مضبوط پکڑو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو تا کہ تم پرہیز گار ہو جاؤ۔"

سورت بقرہ میں بنی اسرائیل کے اعمال کی تذکیر پڑھتے ہوئے ایک پنجابی محاورہ رہ رہ کر یاد آتا ہے:

"نوئے کم کر، دھیے کن دھر"۔ (بہو کو کام کرنے کا جب زبان سے حکم دیا جائے تو عقلمند بیٹیاں بھی خود بخود کام میں ہاتھ بٹانے لگتی ہیں ان کی عزت اسی میں ہے کہ خود بخود کام آمادگی سے انجام دیں اور اپنے والدین کی عزت اور فخر کا باعث بنیں)

امت مسلمہ کو بنی اسرائیل سے متعلقہ ان آیات سے کچھ ایسا ہی سبق لینے کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالی نے بنی اسرائیل سے کئی مواثیق لیے۔ مثلاً اللہ تعالی کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنے کا عہد، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پہچان مدد اور نصرت اور ان پر ایمان لانے کا عہد، تورات کو مضبوطی سے تھامنے کا عہد، تورات کے احکامات کو کھلم کھلا بیان کرنے اور انہیں نہ چھپانے کا عہد وغیرہ وغیرہ۔

بنی اسرائیل کا شیوہ یہ رہا کہ انہوں نے اپنے رب خالق مالک اللہ کی کسی نعمت اور ہدایت کو خاطر میں نہ لایا۔ وہ اللہ کی نافرمانی میں اس قدر بیباک ہو گئے کہ اگرچہ حضرت موسی کلیم اللہ ان کے درمیان تھے، اللہ نے اپنے احکام کی پابندی کرانے کے لیے ان پر طور کو بلند کیا۔ اس طرح موت سے ڈر کر وہ تورات پر عمل کے لیے کچھ آمادہ ہوئے۔

(خذوا ما آتیناکم بقوۃ) جو کچھ ہم نے تمہیں دیا (یعنی تورات) قوت (بھرپور جد اور اجتہاد اتباع و عمل) سے اسے پکڑو۔

اللہ تعالی کے کتاب نازل کرنے کا تقاضا اس پر فکر و تدبر اور "عمل" کرنا ہے نہ کہ محض زبان سے اس کی تلاوت و قراءت۔

"شریعت پر عمل کو افراط و تفریط سے بچانا ہے"۔۔۔

یہی صورت انسان کی طاعات و عبادات میں رغبت اور معاملات میں استقامت و درستی پیدا کر سکتی ہے۔ اسے شگفتہ چست اور چاک و چوبند بنا سکتی ہے۔

کتاب(احکام شریعت) کو قوت سے پکڑنے کے مفہوم پر تدبر ضروری ہے ورنہ غیر فطری سہولت پسندی اور رخصتوں کی سطحی خواہشات،دوسری طرف غلو اور حیلہ بازی سے شریعت منہدم ہو جائے گی۔انسان شارع کے مقاصد یعنی شریعت پر عمل کو اپنے گلے کا پھندا قرار دے کر اسے اپنے گلے کا طوق جان کر اتار پھینکے گا۔

ابھی ہماری زندگی کو درپیش ایک بڑا مسئلہ اس دور میں شریعت پر عمل ہی تو ہے۔

اس سلسلے میں مسلمانوں کی اکثریت جس افراط و تفریط کا شکار ہو رہی ہے اس میں اس کی رہنمائی اور تربیت بہت اہم ہے۔اپنی زندگیوں اور روزانہ معمولات میں اسلامی شریعت پر عمل اللہ تعالی کی طرف سے ڈالی گئی وہ ذمہ داری ہے جو سب انسانوں پر ڈالی گئی ہے۔کلمہ طیبہ کا اقرار کرنے والا معاشرے کا ہر فرد قرآن پر عمل کرنے کا پابند ہے۔

اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے مجھے اور آپ کو زندگی کی اس نعمت سے آج اور ابھی سے تیاری پکڑنی ہے۔

تو پھر۔۔۔۔

تیار ہیں؟؟؟

اپنی تیاری کا حال شامل کر کے اس خیر کی کاوش میں حصہ ڈالیے۔

☆☆☆☆☆

حیلے

حیلوں پر جب کبھی بحث ہو گی یہود کا "یوم سبت "لازمانوک زبان پر اترے گا۔بنی اسرائیل پر مسلسل نعمتوں اور ان کی مسلسل نافرمانیوں میں سے ایک نافرمانی ہفتے کے دن آزمائش بھی ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے یہودیوں کو ان کے آباواجداد کے غلط طرز عمل بتا کر اس سے بچنے کی نصیحت کی جا رہی ہے۔

وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـٕیْنَ(البقرۃ:65)

"اور بے شک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں کے وہ جنھوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے ان سے فرمایا کہ ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے۔"

اللہ تعالی نے ہفتے کے چھ دن ان کو ضروریات زندگی کے لیے کام کاج کی اجازت دے رکھی تھی۔بس ہفتے کے دن کی مناہی تھی۔

آزمائش سخت تھی ۔یہ قوم مقام ایلہ بر لب ساحل آباد تھی۔ان کا پیشہ مچھلیاں پکڑنا تھا۔عام دنوں میں اتنی مچھلیاں نظر نہیں آتی تھیں جتنی ہفتے کے دن۔اس قدر مچھلیاں دیکھ کر ان کا ایمان ڈولتا۔بالآخر اس مسئلے کے حل کے لیے انہوں نے اپنے تیئں "حیلہ "کیا۔ساحل کے پاس گہرے حوض بنائے۔ہفتے کے دن کثیر تعداد میں مچھلیاں تیز موجوں میں بہہ کر آتیں اور وہ ان گہرے حوضوں میں پھنس جاتیں اور بہہ کر واپس نہ جا پاتیں۔وہ اتوار کے دن جا کر انہیں آسانی سے شکار کر لیتے۔

"اس حیلے کو اللہ تعالی نے ان کی عقلمندی قرار نہیں دیا بلکہ اللہ تعالی ناراض ہوا اور اسے حکم عدولی قرار دیا"۔

اللہ کے حکم کی اہمیت کو نہ سمجھنے کی ان کی روایت تسلسل سے آرہی ہے۔البقرہ کی پچھلی آیات اس کی گواہ ہیں۔

حکم پر عمل نہ کرنے والوں کو اللہ تعالی نے سزا میں " قردۃ"یعنی بندر بنا دیا۔

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ(البقرة:66)

ترجمہ :

"تو ہم نے اس بستی کا یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے والوں کے لیے عبرت کر دیا اور پرہیز گاروں کے لیے نصیحت موعظت اور نصیحت متقین پر کارگر ہوتی ہے۔آیئے اپنی زندگی میں سے ایسے تمام حیلے ترک کر دیں جس سے حکم الہی کی نافرمانی ہوتی ہے۔"

آپ کے پاس بھی ان روزمرہ زندگی میں درپیش ان حیلوں کی کچھ مثالیں ہیں۔ان کا تعارف کرائیے اور بچنے کی راہیں سلجھایئے۔۔۔۔

قرآن فہمی میں اپنا حصہ ڈالیے۔

☆☆☆☆☆

قاتل کی تلاش۔۔۔۔۔

کے لیے جانور ذبح کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

جی ہاں

یہ وہ سوال ہے، جو "مناسبت" تلاش کرنے والے اصحاب عقل و دانش قوم موسی علیہ السلام کا تھا۔

بندہ قتل ہو چکا۔

اب قاتل کو ڈھونڈنے اور گائے کو ذبح کرنے میں کیا مناسبت ہے؟

اسی لیے جب حضرت موسی علیہ السلام نے رب کا حکم سنایا:

وَإِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ (البقرة:67)

"اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو، انہوں نے کہا کیا تو ہم سے ہنسی کرتا ہے، کہا میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ جاہلوں میں سے ہوں۔"

"حکم" اور واقعے میں "مناسبت" تلاش کرنے والوں کی عقل "حکم" درست ہونے سے انکاری ہو گئی۔

قوم نے موسی علیہ السلام سے پوچھا کہ کہیں تفریح طبع کے لیے یہ مذاق تو نہیں؟

بہت اہم ہے:

یہ سوچنا ہے کہ ترازو کے ایک پلڑے میں رب کا حکم ہے جسے اللہ کا نبی خود سنا رہا ہے

اور

دوسری جانب غیر نبی وہ لوگ جو نہ تو حقائق کو جانتے ہیں اور نہ ہی حقیقت اولی: اللہ تبارک و تعالی کی پہچان اور معرفت رکھتے ہیں محض اپنی عقل اور مشاہدے کو حکم اور وحی کے مقابلے میں تول رہے ہیں۔

ہمیں یہی سمجھنا ہے کہ

"عقل" اللہ تعالی کی طرف سے دی ہوئی نعمت ہے اسے "وحی کی اتباع" میں خرچ کرنے سے درست نتائج حاصل ہوں گے۔"

اللہ تعالی کے احکام میں اپنی عقل کی مدد سے درست "مناسبت" تلاش کرنے میں کچھ افراد ایسے جذباتی ہو جاتے ہیں کہ جو خود کو سجھائی دیا وہی درست اور دوسری کسی رائے کی گنجائش نہیں دیتے۔اسی کو عقل کل مانا جائے۔

حضرت موسی نے اپنی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم پہنچایا۔ قوم کا کام، اعتراض کرنا نہیں بلکہ پیروی کرنا تھا۔ بے چون وچرا اس اطاعت پر ثواب الگ ملتا اور اللہ کے نبی کا ساتھ۔۔۔۔۔اس عمل کے بروقت اور نافع ہونے کا ثبوت ہوتا اور دل کی تسلی و تشفی کا باعث بنتا۔

مسلمان اپنے کردار پر نظر ڈالیں۔۔۔۔۔

سوچیے

"مجھ تک اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جو احکام پہنچے میں نے انہیں درست ماننے کے لیے مناسبتیں ڈھونڈنے میں وقت اور دھیان صرف کیا ہے یا اتباع کی کوششوں میں ؟"

مثالیں:

1۔ سرقہ (چوری) ثابت ہونے پر ہاتھ پیر کاٹنے پر اعتراض۔

2۔ تخلیہ میں نا محرم مرد اور عورت کی ملاقات کی مناہی پر اعتراض

3۔خوشیوں شادی بیاہ اور دیگر مواقع پر نمود و نمائش اور اسراف سے بچنے کی تعلیمات پر اعتراض

4۔ تمسخر اور استہزاء سے بچنے کی تعلیمات پر اعتراض

5۔اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنانے کے لیے استعماری زبان اور طریقوں پر عمل۔۔۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ

ایمان کا تقاضا ہے کہ قیل و قال اور حیل و حجت پیش کر کے فرار ہونے کے بجائے کہیں "اسلمت"۔۔۔پھر دیکھیے اللہ کی دی ہوئی آسانیاں بھی میسر ہوں گی۔یہ اللہ کا وعدہ ہے۔

☆☆☆☆☆

وہ کرو جو تمہیں حکم دیا جا رہا ہے

کیس سٹڈی:

کمرے میں ماں بیٹی موجود ہیں۔ کمرے کا واحد دروازہ کھلا ہے۔

والدہ: دروازہ بند کر دو۔ دروازہ مگر کیوں؟

کون سا دروازہ؟

ہمارے کمرے کا؟

یا وہ سامنے باجی کی کمرے کا؟

یا باہر صدر دروازے کا؟

یا

پھر دل کا دروازہ؟

کیا اس حکم کو سمجھنا ایسا ہی مشکل تھا

یا

یہ پس و پیش بیٹی کی نافرمانی ہے،

یا غائب دماغی کی کیفیت ہے،

یا وہ کسی شدید نفسیاتی الجھن میں ہے،

یا اسے اپنے کمرے کے دروازے سے زیادہ باجی کے کمرے کا دروازہ بند کرنے کی فکر ہے،

یا اسے صدر دروازے سے کسی ان چاہی شخصیت کے آدھمکنے کی فکر ہے،

یا

اسے گرمی لگ رہی ہے اور وہ اس سے بچنے کے لیے انجان بن رہی ہے۔

یا

اسے والدہ کے سامنے اپنی کسی کوتاہی یا راز افشا ہونے کا ڈر ہے؟

یا اسے حکم دینے والی کی ذہنی صحت پر شبہ ہے؟

جو کچھ بھی ہے۔جو چیز مد نظر رکھنے والی ہے وہ یہ ہے کہ جب" محکم "واضح حکم کی سمجھ نہ آئے تو مسئلہ ایمان کی پختگی میں ہے۔مسئلہ "اسلمت"(میں فرمانبردار ہوا) میں ہے۔مسئلہ تعلق میں ہے۔حاکم کے مقام سمجھنے میں ہے۔۔۔یا کچھ اور۔۔۔۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۚ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ(البقرة:68)"انہوں نے کہا کہ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے جو نہ تو بوڑھی ہے اور نہ بالکل کم عمر بلکہ ان دونوں کے درمیان ہو۔تو وہ کرو جس کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے۔"

قاتل کے بارے میں جاننا ہے تو اے بنی اسرائیل گائے ذبح کرو۔

کیا یہ پیغامبر کا مذاق ہے؟

اچھا اپنے رب سے پوچھ کر بتاو۔

گائے کیسی ہو؟

نہ بوڑھی اور نہ کم عمر۔ان کے درمیان والی عمر کی گائے ذبح کرو۔

بے جا سوال نہ کرو۔جو کہا جارہا ہے وہ کرو

کیا اب بھی سوال اٹھ سکتا ہے کہ گائے کیسی ہو؟

اور اگر ابھی بھی حکم سمجھ نہ آئے تو وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

فافعلوا ما تؤمرون..

یہ حکم صرف بنی اسرائیل کے لیے ہے؟

☆☆☆☆☆

خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا

"ہر کام میں بہترین راہ افراط و تفریط سے بچنا ہے۔"

یہ اصول قرآن مجید کی بیشتر آیات سے ملتا ہے۔

ان میں سے ہی ایک آیت سورۃ البقرۃ کی آیت 68 ہے۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ -قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ-عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ-فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ(البقرۃ:68)"انہوں نے کہا کہ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے کہ وہ گائے کیسی ہے؟ فرمایا: اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے جو نہ تو بوڑھی ہے اور نہ بالکل کم عمر بلکہ ان دونوں کے درمیان درمیان ہو۔ تو وہ کرو جس کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے"۔

یہود کا اللہ تعالی کی بارگاہ میں نبی موسی علیہ السلام کے ذریعے غیر ضروری سوالات کرنا دنیا بھر کے سلیم الفطرت لوگوں کو عبرت دلاتا ہے اور دلاتا رہے گا۔

تعلیم و تعلم کے کچھ اور پہلو بھی اسی آیت میں موجود ہیں:

"آیت میں وسطیت کی فکر کی تعلیم دی گئی ہے۔ دو انتہاؤں سے بچتے ہوئے درمیان کی راہ اختیار کرنا"

"گائے کیسی ہو؟"

ایک غیر ضروری سوال تھا۔ ایسے سوال پر عتاب اور غصہ ہونا ممکن ہے۔۔۔

لیکن اللہ حکیم علیم رووف رحیم کا جواب "حکمت" سے بھرپور:

نہ بوڑھی ہو اور نہ نو عمر

بلکہ

ان دونوں کے درمیان کی عمر کی ہو۔

اس سوال و جواب سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے کہ

1۔ "جب رہنمائی کرو تو جاہل کے رویے کو دیکھ کر جوابی جہالت پر نہ اترو بلکہ حق پر استقامت اور حکمت سے رہنمائی کرو"۔

2۔ کاموں میں افراط و تفریط کی انتہاؤوں سے بچنا بہت سی مصیبتوں سے بچالیتا ہے۔

میانہ روی بہترین انتخاب ہوتا ہے چاہے تعلقات بنانے میں ہو۔رویوں میں ہو۔مال خرچ کرنے میں ہو۔دنیاوی آسائشات جمع کرنے میں ہو۔وغیرہ۔

☆☆☆☆☆

تحلیل کلام

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ-قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ-عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ-فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ(البقرۃ:68)

"انہوں نے کہا کہ آپ اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے کہ وہ گائے کیسی ہے ؟فرمایا:اللہ فرماتا ہے کہ وہ ایک ایسی گائے ہے جو نہ تو بوڑھی ہے اور نہ بالکل کم عمر بلکہ ان دونوں کے درمیان درمیان ہو۔تو وہ کرو جس کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے۔"

بنی اسرائیل کے اس انداز پر غور و فکر کریں۔معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک ان کے دماغوں میں سرکشی کا سودا سمایا ہوا ہے جو انداز تکلم سے صاف نظر آتا ہے۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو بتایا کے قاتل کی حقیقت جاننے کے لیے اللہ رب العزت نے گائے ذبح کرنے کا حکم دیا ہے۔حکم پر عمل تو یوں کرنا چاہیے تھا کہ کوئی بھی گائے پکڑتے اور ذبح کر لیتے۔حکم پورا بھی ہو جاتا اور کٹ حجتی کا رویہ قیامت تک کے لیے ان کے ماتھوں کا جھومر بھی نہ بنتا۔

اس کٹ حجتی کے رویے کو پچھلی آیات سے ملا کر فکر و تدبر کریں تو گائے کے سلسلے بچھڑے سے ملتے دکھائی دیتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام چالیس راتوں کے لیے کوہ طور پر گئے۔بنی اسرائیل پر اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو نگران بنا کر گئے۔بنی اسرائیل نے ان کی ہدایات کو پس پشت ڈال کر بچھڑے کی عبادت شروع کر دی۔ بچھڑے کی محبت ان کے رگ و ریشہ میں رچ بس گئی تھی۔ایک طرح سے گائے ذبح کرنے کا حکم ان کی اسی مشرکانہ رگ پہ چلایا گیا تھا۔گائے کو ذبح کرنا ان کو بہت بھاری لگ رہا تھا۔اس سے بچنے کے لیے سوالات شروع کر دیے۔

الفاظ میں سر کشی یہ ہے کہ بجائے یوں کہتے کہ "اے موسیٰ ہمارے رب سے ہمارے لیے درخواست کیجیے"۔بے نیازی اور بے اعتنائی سے یوں بولے اپنے رب سے یہ دعا کرو۔ گویا تمہارا رب ہے ہمارا نہیں۔

☆☆☆☆☆

رنگ۔جمال اور سرور

رنگوں کا اختلاف بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

جب رنگ کی بات کریں تو دھنک کے سات رنگ مجسم ہو کر ہر اس ذہن پر دستک دیتے ہیں جنہیں بارشیں اچھی لگتی ہیں۔جو فطری مناظر دیکھنے اور محسوس کرنے کے لیے وقت نکالتے ہیں۔مشاہدہ کرتے ہیں اور اللہ تعالی کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں۔دنیا میں جس قدر نیلے پیلے لال سبز۔۔۔رنگ نظر آتے ہیں سب اللہ کی نشانیاں ہیں۔

کائنات میں تمام مخلوقات کے رنگوں میں ترتیب نہیں دی جاسکتی البتہ قرآن مجید میں سب سے پہلے جس رنگ کا تعارف اللہ تعالی ہر قاری قرآن کو کراتا ہے۔

وہ "صفراء" ہے۔

یعنی "پیلا" یا "زرد "

پیلا "سورج" کا رنگ ہے جو دنیا میں زندگی کا استعارہ ہے۔

پیلا "سونے" کا رنگ ہے جو اپنی خوبصورتی کے باعث دنیا کے کثیر افراد خصوصا عورتوں کا پسندیدہ ہے۔

پیلا سرسوں کا رنگ ہے جو ہماری تہذیب میں خوشی کا رنگ ہے۔

پیلا رنگ اپنے اندر روشنی اور جاذبیت رکھتا ہے۔

رنگوں کا انسانی شخصیات پر اثر انداز ہونا بھی شارع حکیم کے احکام کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد کے حصول کا وسیلہ ہے۔اور وہ مقصد نفس انسانی میں سرور کو انگیخت کرنا ہے۔اس طرح "سرور" ایک نفع ہے جسے اللہ تعالی نے خود بھی اہمیت دی ہے۔اس کے فہم کے لیے سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 69 پر تفکر و تدبر اہم ہے۔

اس آیت میں حضرت موسی علیہ السلام، ان کی قوم بنی اسرائیل اور اللہ رب العزت کے درمیان مکالمہ جاری ہے۔ قوم نے حضرت موسی علیہ السلام سے کہا:

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ

کہنے لگے: آپ اپنے رب سے درخواست کیجئے کہ ہمیں صاف صاف بتائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ نے کہا ": للہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے تیز زرد رنگ کی گائے ہو جو دیکھنے والوں کا دل خوش کر دے"۔

پیلا رنگ وسیلہ سرور:

(صفراء فاقع لونھا) میں ایک تصویر پوشیدہ ہے جیسا کہ "گلاب کی پنکھڑی" کے الفاظ سننے سے مِحب کو محبوب کے لب یاد آجائیں.

اسی طرح

(بقرۃ صفراء لونھا) کا حکم سننے سے تصور میں وہ بچھڑا بھی اُبھر سکتا ہے جسے حضرت موسی علیہ السلام کے طُور پر چالیس راتیں گزارنے کے دوران بنی اسرائیل نے معبود بنا لیا تھا۔ اسے سونے کے زیورات پگھلا کر تیار کیا گیا تھا۔ اس کا رنگ اور چمک ایسی ہی یاد پیدا کر سکتی ہے جیسے خوبصورت زرد رنگ کی گائے ہو جو ایسی جاذب نظر ہو کہ نظریں اسے دیکھنے سے سرور کشید کریں۔

اس طرح سے گائے ذبح کرنا دراصل اپنی ہوی و ہوس نفس پرستی اپنی بے جا خواہشات کو "توحید" پر ایمان کی خاطر ذبح کر دینا ہے۔

جو اللہ کی مانے گا اللہ اس کی ضرور سنے گا۔

ویسے آپ کی آنکھوں کو کون سے رنگ بھلے لگتے ہیں؟؟؟

علم نفس یعنی سائیکالوجی اس رنگ کے بارے میں کیا کہتی ہے؟ مختلف زبانوں کا لٹریچر اس رنگ کو کون سے معانی دیتا ہے اور قرآن کی آیات اس رنگ کا تذکرہ کس حوالے سے کرتا ہے؟ اس پر دلچسپ تحقیق ہو سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

المبھمات فی القرآن

ایک فن ایک علم ___ جسے قرآن مجید سے کشید کیا گیا ہے۔ مبہم ہر وہ چیز جو غیر واضح ہو۔

کیا ہر چیز کا واضح ہونا شریعت کا مقصود ہے؟

قرآن مجید منبع شریعت اسلامی سے ثابت ہے کہ ہر چیز کی وضاحت اور تفصیلی تعارف ضروری نہیں۔

جیسا کہ گائے کے واقعے میں مقتول کا نام و نسب، گائے کے مالک کا تعارف، گائے کے کس حصے کو مقتول کے جسم کے کس حصے سے ٹکرایا گیا؟

یہ معلومات نہ ہونے سے بظاہر مبہم صورتحال نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہر چیز کا اتنا ہی تعارف کرایا گیا ہے جتنا جاننا ہمارے ایمان اور عقل کی پختگی کے لیے ضروری ہے۔

ہم سب سے چھپ سکتے ہیں مگر اللہ سے چھپ نہیں سکتے۔ ہم سب انسانوں سے اپنا کردار چھپا سکتے ہیں لیکن اللہ کے سامنے سب کچھ عیاں ہے۔

بنی اسرائیل میں سے جس شخص کو قتل کیا گیا پھر سب قاتل بھی اور اسے جاننے والے بھی خود کو انجان ظاہر کرنے لگے۔ الزام ایک دوسرے پر لگانے لگے

اللہ نے فرمایا:

وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِیْهَا ؕ-وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ (البقرہ:72)

"اور یاد کرو جب تم نے ایک شخص کو قتل کر دیا پھر اس کا الزام کسی دوسرے پر ڈالنے لگے حالانکہ اللہ ظاہر کرنے والا تھا اس کو جسے تم چھپا رہے تھے۔"

فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ-كَذٰلِكَ یُحْیِ اللّٰهُ الْمَوْتٰىۙ-وَ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ(73)

"تو ہم نے فرمایا (کہ) اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو۔ اسی طرح اللہ مردوں کو زندہ کرے گا۔ اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ۔"

اللہ اپنی نشانیاں ہماری عقلوں کو جگانے اور سدھانے کے لیے دکھاتا ہے۔ غفلت کی نیند سلانے کے لیے نہیں۔

☆☆☆☆☆

کیا قرآن مجید کا ترجمہ کرنا تحریف ہے؟

کسی انسان کے کلام میں معمولی لفظی تبدیلی بہت بڑے مسائل پیدا کر دیتی ہے۔ اور جب مسئلہ اللہ تعالی کے کلام میں تحریف کا ہو تو یہ صاف ستھرا ایمان کا نقصان ہے۔

عقل اور علم ہونے کے باوجود "تحریف": کلام میں ہیرا پھیری "قساوت قلبی": دل کی سختی کی نشانی ہے۔

یہودیوں کے دل کی سختی کی وضاحت کے لیے اللہ تعالی نے پتھروں کی سختی کی مثال دی۔ پتھروں سے پانی جاری ہونے اور اللہ کے خوف سے گر پڑنے کی خوبیوں کو بیان کیا۔ یہود پے در پے نعمتوں، پیغمبروں، ہدایت کے ابلاغ کے باوجود، اللہ کے کلام سے پہلو تہی کرتے اور ایمان نہ لاتے سختی میں پتھروں سے بھی آگے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور انصار مدینہ کی خواہش تھی کہ یہود ایمان لے آئیں۔ اس پر اللہ تعالی نے فرمایا:

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:75)

"کیا تمہیں امید ہے کہ یہود تمہارے کہنے پر ایمان لے آئیں گے حالانکہ ان میں ایک ایسا گروہ بھی گزرا ہے جو اللہ کا کلام سنتا تھا پھر اسے سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر بدل ڈالتا تھا۔"

سمجھ لینے کے بعد بدل ڈالنا بہت بڑا عیب ہے اور ثابت کرتا ہے کہ دل ایمان سے یکسر خالی ہے۔ دراصل یہی منافقت ہے۔

یہود کا ایک گروہ کلام اللہ کو سن لیتا۔ اس کو اچھی طرح جان لیتا سمجھ لیتا پھر اس کے لفظوں اور معانی دونوں میں تحریف کرتا۔ یہود نے یہی رویہ حضرت موسی سے اس وقت بھی اپنایا جب انہیں قاتل کو جاننے کے لیے گائے ذبح کرنے کا حکم ملا تھا۔

اب مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کی زبان عربی ہے اور تمام مسلمان عرب نہیں ہیں بلکہ مختلف زبانیں بولنے والے ہیں۔ مختلف زبانیں اللہ کی نشانیاں ہیں۔ جب قرآن مجید کا ترجمہ دوسری زبان میں کیا جائے تو کیا اس عمل کو "تحریف" کہیں گے۔ اللہ کے کلام کے معانی کی حد بندی اللہ خود کرے گا یا اللہ کا رسول جس پر کلام نازل ہوا۔ قرآن قیامت تک کے ہر انسان کی رہنمائی کے لیے بھیجی گئی آخری آسمانی کتاب ہے۔ مختلف زبانیں بولنے

والوں کو قرآن سکھانے کے لیے کن پابندیوں کے ساتھ ترجمہ و تفسیر کی جائے کہ "تحریف" کے زمرے میں نہ آئے۔

☆☆☆☆☆

جلوت و خلوت

نظر میں ہونا اور موجودگی کا احساس انسانی رویوں کو
یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔
آپ کس سے ملتے ہیں؟
کس سے معاملات کرتے ہیں؟ آپ کی ملاقاتوں کے مقاصد کیا ہیں؟
یہ تمام ترجیحات آپ کی جلوت کو مختلف رنگوں سے بھر دیتی ہیں۔ بعض ملاقاتیں آپ کے اندر محبتوں کو پروان چڑھاتی ہیں اور بعض ملاقاتیں آپ کو اپنی شخصیت پر پرتیں چڑھانے، بہروپ بھرنے پر مائل کر دیتی ہیں۔۔۔ یہ اختلاف اس باعث جنم لیتا ہے کہ
"آپ کس سوچ اور ہدف کے تحت ملاقات کرتے ہیں؟"
آپ کو کلاسیکی موسیقی سے لگاؤ ہے لیکن ابھی آپ جس شخصیت کی محفل میں ہیں جو آپ کی باس ہے یا جس کے ساتھ آپ نے بزنس ڈیلنگ کرنا ہے اسے موسیقی سے نفرت ہے۔ محض اس کی توجہ کے لیے آپ بھی موسیقی کی برائیوں کو بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔۔۔
بظاہر یہ ایک مثال ہے لیکن اگر بغور جائزہ لیں تو دور حاضر میں ہر ایک اس قدر افادیت پسند ہو چکا ہے کہ اس کی اپنی کوئی اقدار، اخلاقیات اور روایات نہیں رہیں بلکہ اصل مقصد و محور اپنا مفاد اور منفعت مالی حاصل کرنا ہے۔
ہمارے پیارے نبی سیدنا محمد خاتم الانبیاء والمرسلین کے عہد زریں میں مدینہ میں بسنے والے یہود نے "نفاق" کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ جب وہ اہل ایمان سے ملتے تو خود کو مومن ظاہر کرتے۔۔۔۔۔ یہ اظہار ایمان دنیاوی مال و منفعت کے حصول کے لیے تھا۔ اس بات کی حقانیت اس سے واضح ہو جاتی جب وہ اپنے جیسے منافقین کے درمیان ہوتے تو ایک دوسرے کو تنبیہ کرتے کہ مسلمانوں کے سامنے تورات کی وہ آیات جو نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ

وسلم کی نعت اور ان کی رسالت کی حقانیت کو بیان کرتی ہیں، مت لاو انہیں راز ہی رہنے دو ورنہ وہ تورات میں سے تمہارے رب کے حضور اپنے لیے دلائل اور حجج بیان کرنے لگیں گے۔ کیا تم میں عقل و شعور نہیں؟ یوں وہ قصدا رسالت نبوی کا انکار کر رہے تھے جب کہ حقیقتا یہ اعتراف نبوت ہی تھا اگرچہ بغض انہیں اقرار سے روک رہا تھا۔

انہی احوال کو اللہ عزوجل نے یوں فرمایا:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (البقرة:76)

"اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لے آئے ہیں، اور جب وہ ایک دوسرے کے پاس علیحدہ ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کیا تم انہیں وہ راز بتا دیتے ہو جو اللہ نے تم پر کھولے ہیں تا کہ وہ اس سے تمہیں تمہارے رب کے روبرو الزام دیں، کیا تم نہیں سمجھتے۔"

یہود کی جلوت و خلوت کی کوتاہیاں ہمارے لیے باعث عبرت بیان کی گئی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی کی ذات و صفات اور ان صفات کے تقاضوں میں توحید کے اس سبق کو یہود نے بھلا رکھا تھا۔ ان کے زعم میں یوں وہ اللہ تبارک و تعالی کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ وہ اللہ سے حقائق اشیاء کو چھپا سکتے ہیں۔

کیا یہ تصور توحید آپ کو درست لگتا ہے؟

☆☆☆☆☆

اللہ اللہ

ذرا اللہ رب العزت کی موجودگی کو محسوس کیجیے اور اس کے بندے کی یہ باتیں سنیے۔۔۔

محترم جیسا کہ میں آپ کو بتا رہا ہوں آپ اس سعد پتھر کو دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں بدھ کے دن صبح دس بجے پہن لیں اور ٹھیک اسی وقت باجرہ سات مرتبہ اپنے سر سے پیچھے کی طرف پھینکیں اور واپس مڑ کر نہ دیکھیں۔ آپ کے تمام مالی اور صحت کے مسائل حل ہو جائیں گے۔۔۔

آپ کے غم خوشی میں بدل جائیں گے۔۔۔

آپ کا رشتہ فروری کے دوسرے ہفتے میں اپنے خاندان میں ہو گا۔۔۔

لیکن اس سب کے لیے آپ کو یہ مبارک پتھر انگوٹھی میں جڑوا کر پہننا ہو گا۔۔۔

آپ کا نام آپ کے ستارے کے حساب سے درست نہیں۔۔۔

اس کی نحوست آپ کو زندگی میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گی۔۔۔۔۔

اللہ کے ایک عاجز اور حقیر انسان کا غیب کے بارے میں اس قدر یقین اور اعتماد سے یاوہ گوئی کرنا کہ گویا مشیت ایزدی اسی کے فرامین کا دوسرا نام ہے۔۔۔ یہ سب اقوال زریں بولتے وقت لمحے بھر کے لیے اللہ تعالی کی ذات کو حاضر و ناظر جانتا۔ اس کی صفات کمال کا خیال آتا تو کیا وہ یہ سب کچھ کہنے کا حوصلہ رکھتا تھا؟۔۔۔

توحید کا درست تعارف کسی بھی انسان کو ایسی واہیات رہنمائی کرنے پر شیر ہونے سے ضرور روکتا۔

توحید کے عقیدے کی کمزوری نے اور رسول اللہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو چھپانے کے ناپاک ارادے نے یہود کو اس غلط رویے پر مائل کیا کہ وہ ایک دوسرے کو تورات کی آیات دنیا سے چھپانے پر اصرار کرتے

وائے حیرت وہ "اللہ" کو غافل انسانوں کی مانند خیال کرتے۔

انھیں اس کے "حاضر و ناظر" ہونے کا خیال بھی نہ ہوتا۔۔۔ چنانچہ اس کوتاہی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے اللہ تعالی نے فرمایا:

أَوَ لا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ ما يُسِرُّونَ وَ ما يُعْلِنُونَ (البقرة :77)

"کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے کہ جو کچھ یہ چھپاتے اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں، اللہ کو (سب) معلوم ہے۔"

زندگی میں کئی مقامات پر جب اللہ کے حاضر و ناظر اور شاہد ہونے کو بھلا کر محض اپنی ہوا ہوس اور خواہشات کو آسودہ کرنے کی غلطی ہم میں سے ہر ایک سے ہوتی ہے۔ چاہیے کہ ہر دم اپنے عقیدہ توحید کی درستی کے لیے علم اور عمل بڑھایا جائے۔

آپ کا کیا خیال ہے؟

☆☆☆☆☆

سطحی سوچ و فکر

کمزور ترین لمحات میں کوئی بھی انسان بہک سکتا ہے، کجی اپنا سکتا ہے اور خود پسند ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ آپ کو اس رائے میں تردد فطری ہے۔

"انسانی خواہشات اور کمزور لمحات کا گہرا تعلق ہے"۔

کسی بھی چیز کو حاصل کر لینے کی بے لگام خواہش آپ کے اندر ہیجان برپا کر سکتی ہے۔۔۔

یہاں تک کہ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح کرا دیتی ہے۔۔۔۔

کبھی آپ کے ساتھ ایسا ہوا؟

نہیں؟

تو دیکھیے جنہیں "مال" چاہیے وہ اس کی خواہش میں حلال و حرام کی تمیز کھو دیتے ہیں۔ آج کل ٹک ٹاک اور سنیک وڈیوز پر محض لائک کر کے چھتیس روپے حاصل کرنے والی نوجوان نسل کمائی کے حلال ذرائع کی تعلیمات سے جان بوجھ کر خود کو بے بہرہ رکھتی ہے۔

مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں یہ خواہشات پہلے پہل تو خیالات پر حاوی رہتی ہیں۔۔۔ پھر اوہام بن جاتی ہیں۔۔۔ رفتہ رفتہ ظنون اور بالآخر نظریہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔۔۔

ایسے میں زبردست امنگ اٹھتی ہے کہ اس دنیا کے سب لوگ اس نظریہ کو حقیقت مان لیں۔ آپ کے اوہام و ظنون کو سچ جانیں۔ یہی نہیں اب حقیقت کی تلاش کو چھوڑ دیں۔ ہمیشہ کے لیے ترک کر دیں۔۔۔۔

ایسے لوگ عام طور پر پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ ناخواندہ یا ایسی واجبی تعلیم رکھنے والے جو محض اپنے نام کے سگنیچر کر لیں یا محض لکھی ہوئی عبارت کو بدقت پڑھ لیں مگر اس کے "فہم" سے عاری ہوں۔

"کتاب کا علم "بہت بڑی سعادت ہے۔"وحی ربانی " اوہام پر مبنی نہیں۔ جو اصل میں "علم " ہے۔ کتاب کے ہاتھوں میں ہونے کے باوجود ہوا و ہوس کے شیدائی اس کی حقیقت کو پا نہیں سکتے۔ وہ اپنی کم علمی سے اس" متاع عزیز" پر پردے ڈالنے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔۔۔

سادہ سی مثال ہے کسی شخص کو پھلوں کا لدا پھندا تیار باغ مل گیا۔ حرص و ہوس کا پجاری دوسرے لوگوں کو باغ کے پھلوں کے قریب نہیں آنے دیتا یہاں تک کہ ان کے بیج بھی نہیں دیتا۔ چھپا لیتا ہے۔ کوئی زیادہ کریدے تو

انہیں گلے سڑے پھل دکھا کر متنفر کرتا ہے۔۔۔ مقصد یہ ہے کہ اس امتیاز، عزت اور فضیلت میں کوئی دوسرا شریک نہ بن جائے۔

یہ سب تمہید دراصل یہود کے ان رویوں کو سمجھنے کے لیے باندھی گئی جن کا تذکرہ اللہ رب العالمین نے قیامت تک کے ہر قاری قرآن کے فہم و عبرت کے لیے قرآن مجید میں محفوظ کر دیا۔

اب ہے کوئی سوچے سمجھے اور عبرت حاصل کرے؟؟؟

عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک یہودی گروہ ایسے ہی ان پڑھ جاہلوں پر مشتمل تھا۔

انہوں نے اللہ تعالی کی وحی "تورات" میں موجود نبوت و رسالتِ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حقائق سے صرف نظر کر رکھا تھا۔ تورات کی تعلیم کی بجائے اپنی آرزووں اور تمناوں کی تکمیل میں کوشاں تھے۔

اللہ تعالی نے انہی کے بارے میں فرمایا:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ(78)

"اور بعض ان میں سے ان پڑھ ہیں جو کتاب نہیں جانتے، سوائے جھوٹی آرزوؤں کے، اور وہ محض اٹکل پچو باتیں بناتے ہیں۔"

یعنی مقام عبرت ہے کہ یہ گروہ یہود "کتاب والے" ہیں اور "کتاب کا علم" نہیں رکھتے۔

دراصل جہاں علم ہوتا ہے وہاں شک اور تردد نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کے اقرار سے ان کی تمنائوں اوہام و ظنون پورے نہ ہو پاتے چنانچہ ان حقائق کو پردے میں رکھنے پر اصرار کیا۔

ضروری ہے کہ آج ہم قرآن مجید کی تلاوت، فہم اور اپنی عملی زندگی پر اس کے اطلاق کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں۔

اللہ تعالی ہم سب کو قرآن مجید کا فہم اور اس پر اخلاص سے عمل کی توفیق دے۔ آمین

☆☆☆☆☆

"تبدیلی تغیر اور زیادتی"

یکدم جنم نہیں لیتیں۔ ان کا ہمیشہ منفی رویوں سے نشوونما پانا ضروری نہیں۔

بعض اوقات "مثبت رویوں" کے حد اعتدال سے بڑھ جانے سے بھی یہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ جب بات اللہ تعالی کے دین "اسلام" کی ہو، "شریعت محمدی" کی ہو تو میرا اور آپ کا فرمان کہ و مہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔۔۔

بہت سے تعلیم یافتہ اور ناخواندہ مسلمان بھی شریعت کو "من جانب اللہ" ماننے کے باوجود اپنی" رائے۔۔۔ فہم اور۔۔۔ تعبیر" کو شریعت منوانے پر اصرار کرتے نظر آتے ہیں۔۔۔ اس کے لیے باقاعدہ گروہ بندی کی جاتی ہے اپنے معتقدین بڑھانے کے لیے سیاہ سفید ایک کیا جاتا ہے۔ یہ رویہ یہود کے اس گروہ کے رویے سے یکسر مشابہ ہے جس کے بارے میں اللہ تعالی نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ(البقرۃ:79)

"سو افسوس ہے ان لوگوں پر جو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے تاکہ اس سے کچھ روپیہ کمائیں، پھر افسوس ہے ان کے ہاتھوں کے لکھنے پر اور افسوس ہے ان کی کمائی پر۔"

لگتا ہے کہ لکھے جانے کا خطرہ بولے جانے سے بھی شدید ہے جیسا کہ اللہ تعالی نے ان لوگوں کو ویل کے عذاب کی وعید دی جنھوں نے اپنی ہوا و ہوس کی تحریروں کو "من جانب اللہ "یعنی وحی کہا اور ان تحریروں سے مال عہدے شہرت دیگر دنیاوی منافع، اور لوگوں کی رضامندیاں کمائیں۔

اسلام اعتدال کا داعی ہے۔ جہاں آپ حد اعتدال سے آگے گزر گئے یا پیچھے رہ گئے تو آپ افراط یا تفریط کا شکار ہو گئے۔۔۔ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منحرف ہو گئے۔۔۔ کمی اور زیادتی دونوں خطرناک۔۔۔ دین اللہ کا حکم، دین اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم، تلقین، تربیت، تشریح تزکیہ، حکمت۔۔۔ کا نام ہے۔

ضرورت ہے کہ اصل "اسلام" کو جانا جائے اس پر چڑھائی گئی ہوا ہوس کی پرتوں کو اتارا جائے۔ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر اپنے علم میں اضافہ کیا جائے اور دین اسلام پر عمل کی سہولت کو اپنی ذاتی پسند و ناپسندیدگی کی آلائشوں سے پاک کیا جائے۔

اس سلسلے میں بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں تاہم عام لوگوں کے جملوں اور رویوں سے اصل اسلام کو الگ پہچانا جا سکتا ہے

مثلاً اکثریت کے جملے:۔

1۔ میری خواہش ہے کہ ہر سال اللہ مجھے حج پر بلالے۔ (یہ دینی ضرورت نہیں، خواہش نفسانی ہے)

2۔ مسجد میں قیمتی ٹائلز لگوانے کے لیے فنڈز دے کر عوام اپنے لیے جنت خرید رہی ہے۔ (ٹائلز ضرورت دین نہیں۔ یہ خواہش انسانوں کی ہے۔ رحمان کا حکم نہیں)

3۔ روزہ افطار کرانے پر اجر ہے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں روزہ داروں کے لیے پر تکلف افطار پارٹیز رکھنے والے دین پر عمل کر کے اصل خدمت کر رہے ہیں اجر سمیٹ رہے ہیں۔ (دکھاوے، تشہیر دولت اور بزنس ڈیلز کے لیے کی جانے والی پارٹیز کس زمرے میں دینی کاروائی ہو سکتی ہیں۔)

اللہ تعالیٰ مجھے اور سب مسلمانوں کو دین اسلام کا پابند، اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرنے والا بنادے۔ آمین

☆☆☆☆☆

درست طریقہ استدلال میں قرآنی رہنمائی

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (80)

"اور کہتے ہیں ہمیں سوائے چند گنتی کے دنوں کے آگ نہیں چھوئے گی، کہہ دو کیا تم نے اللہ سے کوئی عہد لے لیا ہے کہ ہر گز اللہ اپنے عہد کا خلاف نہیں کرے گا، یا تم اللہ پر وہ باتیں کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔"

آپ کسی بات کی سچائی جاننے کا ہنر سیکھنا چاہتے ہیں؟ تو حقیقت کے متلاشی کو قرآن مجید "تقسیم" کا ہنر سکھاتا ہے جیسا کہ سورت بقرہ کی آیت نمبر 80 میں ہمیں یہود کا دعوی پتا چلتا ہے: "ہمیں آگ ہر گز نہ چھوئے گی مگر گنتی کے

چند روز"۔ان کا بیان دو احتمالات رکھتا ہے۔پہلا احتمال یہ کہ اللہ سبحانہ تعالی نے ان سے کوئی وعدہ کر رکھا ہے اور اب وہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا یا انہوں نے اللہ کے حوالے سے جھوٹی بیان بازی اپنی طرف سے کی ہے۔اس طرح کلام کو جب بھی "تقسیم "کیا جائے تو دو احتمالات ہی سامنے آتے ہیں تیسرا کوئی نہیں ہو تا۔

تقسیم کے بعد "سبر "کے ذریعے تمام اوصاف اور احتمالات کی گہرائی اور حقیقت کو جانچا جاتا ہے۔ مثلا یہود کی سچائی کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالی کی طرف سے کیا گیا معاهدہ کوئی دستاویز ان کے پاس بطور دلیل موجود ہو۔

اگر ایسا نہیں تو یقینا انہوں نے اللہ تعالی پر جھوٹ باندھا ہے۔اس طرح سے قیاس کے ذریعے کلام میں موجود علت کا استخراج کرنا قرآنی تربیت ہے۔ قرآن مجید خود اپنے قاری کو عقل و خرد کو وحی کی روشنی میں استعمال کرنے کی لازوال رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

انسانی نفسیات میں تکبر اور عاجزی کے رویے

وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۔۔۔ (البقرة:80)

"اور کہتے ہیں ہمیں سوائے چند گنتی کے دنوں کے آگ نہیں چھوئے گی۔"

آگ کے عذاب پر یقین بھی ہے اور فخر و غرور کی نفسیات ایسی ہے کہ اپنے جرم کو بہت چھوٹا، تقریبا نہ ہونے کے برابر کا اعلان کیا جارہا ہے۔ حضرت موسی علیہ السلام کے کوہ طور پر تشریف لے جانے کے بعد چالیس روز تک "شرک اکبر "کا ارتکاب کرنے والی قوم یہود کے متکبرین نے اپنی خصوصیات یوں بیان کیں کہ محض چالیس دن کے لیے بچھڑے کی عبادت کرنے پر آگ کا عذاب ملے گا پھر اس کے بعد ہم ہی جنت کے وارث ہیں۔

جب کہ اللہ کے چنیدہ بندوں نے گڑ گڑا گڑ گڑا کر خود کو ظالم اور عاجز بیان کر کے اللہ سے معافی چاہی۔ مثلا آدم اور حوا علیہما السلام نے منع کردہ جنت کا پھل کھانے اور جنت سے نکالے جانے پر کوئی حیل و حجت اور پس و پیش نہ کی

بلکہ اپنی خطا کو ظلم اور خسارہ قرار دے کر توبہ کی اور مغفرت طلب کی: (ربنا ظلمنا انفسنا و ان لم تغفر لنا و ترحمنا لنکونن من الخسرین)

☆☆☆☆☆

حقوق اللّٰہ _ حقوق العباد

1۔ حقوق کی تقسیم کے ضمن میں عام طور پر اہل ایمان انہیں دو قسموں میں تقسیم کرتے ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔

اس تقسیم کے پیچھے یہ فہم و فراست دکھائی دیتی ہے کہ اللہ اور اس کے بندوں میں فرق ظاہر کیا جا سکے۔

اگر یہی تقسیم درست ہے تو بتایئے کہ کیا اللہ تعالی کو ہماری عبادات و طاعات کی ضرورت ہے اگر ہم انہیں پورا نہ کریں تو کیا اس کو کوئی نقصان پہنچائیں گے ؟

دوسرا سوال یہ اٹھتا ہے کہ بندوں کے باہمی حقوق کیا ہیں ؟ کیوں ہیں ؟ اگر پورے کیے جائیں تو دنیا و آخرت کا کیا نقصان ہو سکتا ہے ؟ آیا اس کا تعلق صرف فرد سے ہے یا جماعت سے بھی ؟

اللہ تعالی نے جنت و دوزخ کی ترغیب و ترہیب کے بیان کے بعد پھر سے بنی اسرائیل کو ان کا کیا ہوا پختہ عہد یاد کروایا۔ یقینا اس یاد دہانی میں بعد میں آنے والے قیامت تک کے انسانوں کے لیے رہنمائی و تذکیر موجود ہے۔ مقاصد شارع میں سے اہم ترین اعلی و ارفع مقصد صرف اللہ تعالی کی عبادت کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۗ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ(البقرۃ:83)

"اور (وہ وقت یاد کرو) جب ہم نے بنی اسرائیل سے پکا عہد لیا تھا کہ: تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرو گے، اور والدین سے اچھا سلوک کرو گے، اور رشتہ داروں سے بھی اور یتیموں اور مسکینوں سے بھی۔ اور لوگوں سے

بھلی بات کہنا، اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا۔ (مگر) پھر تم میں سے تھوڑے سے لوگوں کے سوا باقی سب (اس عہد سے) منہ موڑ کر پھر گئے۔"

بظاہر یہ لگتا ہے کہ اللہ کا حق اس کی عبادت کرنا ہے اور اس کے بعد بندوں کے حقوق بیان ہو گئے ہیں۔ تھوڑا سا فکر و تدبر کرتے ہی یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ یہ سب حقوق اللہ ہیں۔ ہم اسی کے حکم پر عمل کے پابند ہیں۔ پھر چاہے عبادات ہوں معاملات ہوں یا اخلاقیات۔

☆☆☆☆☆

ترقی پسند معاشرہ_ترقی یافتہ تہذیب

آپ کیسے معاشرے میں رہنا چاہتے ہیں؟

نظم و ضبط عدل اور اخلاق پر مبنی معاشرہ میں۔ ایک ایسا معاشرے جس کے افراد آزاد بھی ہوں اور خوشحال بھی۔ ان کی ترقی میں رکاوٹیں نہ ہوں اور وہ خود پرست بھی نہ ہوں بلکہ دوسرے افراد معاشرے کی ترقی و رہنمائی کے لیے عملاً کوشاں ہوں۔ اگر یہ سب آپ کی خواہش ہے تو آپ کو فقط ایک لازوال طاقت اور اس کے دیئے ہوئے قانون کی پیروی کرنا ہو گی۔ اس کے ساتھ کیے ہوئے معاھدے پر عمل پیرا ہونا ہو گا۔

اللہ تعالیٰ نے یہود کو ایسے ہی معاھدے کی یاددہانی کراتے ہوئے فرمایا:

إِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ(البقرہ:83)

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں سے اچھا سلوک کرنا اور لوگوں سے اچھی بات کہنا اور نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ دینا، پھر سوائے چند آدمیوں کے تم میں سے سب منہ موڑ کر پھر گئے۔

ان آیات میں اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ایک معاہدے کا ذکر ہے جس کی بنیاد توحید کا اقرار اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا۔اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا۔

1. اللہ اور بندے کا تعلق
2. والدین سے حسن سلوک
3. رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں سے حسن سلوک
4. لوگوں سے اچھی بات کہنا
5. نماز قائم کرنا
6. زکات ادا کرنا

مختصر الفاظ میں کوئی بھی صالح معاشرہ تبھی پنپ سکتا ہے جب اس میں معبود حقیقی سے انسان کے تعلق اور انسانوں کے مابین تعلقات اور معاملات کے اصول و قواعد مساوات اور عدل پر مبنی ہوں اس کے ساتھ ساتھ دنیا میں دی گئی مہلت عمل کے لیے بھرپور رہنمائی موجود ہو۔اختتام یعنی آخرت پر اس کے اثرات بھی معلوم اور شائع ہوں۔

عبادات اور معاملات دونوں عقیدہ توحید کے پرتو ہوں۔

"اللہ تعالیٰ نے یہود کی طرح یہ حکم امت مسلمہ کو بھی دیا ہے": **(النساء:36)**

لوگوں سے اچھی بات دراصل دعوت دین ہے: وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ وَعَمِلَ صَالِحًا **(سورۃ فصلت:33)**، اس آیت میں وضاحت ہے کہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے بچنے کی دعوت دراصل اللہ کی طرف بلانا ہے۔

اس سب سے عبادات اور معاملات دونوں کی لازوال اہمیت کا پتا چلتا ہے۔امت مسلمہ کو ان سب میں اپنا مثبت کردار ادا کر کے دنیا اور آخرت دونوں کو سنوارنا ہے۔

اللہ ہم سب کو علم نافع اور عمل صالح کی توفیق دے۔اپنے فضل سے دنیا و آخرت میں سرخرو کرے۔آمین

☆☆☆☆☆

ایک امت کا تصور

ایک امت ہونے کی ذمہ داری کیا ہے؟

بھائی چارہ کیا ہوتا ہے؟

عصبیت کیا ہے؟

عدل کیسے قائم کیا جاسکتا ہے؟

کتاب پر مکمل ایمان لانے کے معانی کیا ہیں؟

معاہدے کی پاسداری کتاب (تورات) والوں کی ذمہ داری تھی یا نہیں؟

امت مسلمہ اس معاہدے سے کیا سبق سیکھ سکتی ہے؟

سورۃ البقرۃ کی آیات: 84،85 کا پس منظر تفاسیر میں چار قبیلوں کے حوالے سے ملتا ہے۔ یہ پس منظر اور اس پر اترنے والی آیات کو پڑھ کر مندرج بالا اور اس طرح کے کئی سوالات ابھرتے ہیں۔

یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر اور بت پرستوں کے دو قبیلے اوس و خزرج۔ بنو قریظہ اوس کا حلیف جبکہ بنو نضیر خزرج کا حلیف تھا۔ جب بھی جنگ ہوتی تو دونوں یہودی قبائل ایک دوسرے کے مد مقابل آ جاتے۔ جنگ کے میدان میں ایک دوسرے کو تورات کی ہدایات کے خلاف قتل کرتے اور جب کوئی یہودی قیدی بن کے آتا تو اس کے چھڑانے کے لیے فدیہ جمع کرتے۔

سورۃ البقرۃ میں ان کے کردار کی کجی اور نقض عہد کو بیان کیا گیا ہے:

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُونَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُونَ أَنفُسَكُم مِّن دِيَارِكُمْ ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنتُمْ تَشْهَدُونَ (البقرة:84)

"اور (یاد کرو) جب ہم نے تم سے پکا عہد لیا تھا کہ: تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور اپنے آدمیوں کو اپنے گھروں سے نہیں نکالو گے، پھر تم نے اقرار کیا تھا اور تم خود اس کے گواہ ہو۔"

اللہ نے انہیں، ان کے اللہ سے میثاق کے سبب ایک امت ہونے کی یاد دہانی کرائی۔ ان کے عمل میں نفس پرستی اور خواہش نفس کے باعث در آنے والی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔

ان کی حالت کا بیان قرآن مجید میں ہے۔ وہ لوگ تو گزر گئے۔ اب اس میں بعد میں آنے والوں کے لیے رہنمائی اور عبرت کا سامان ہے ہم نے بطور امت مسلمہ اس طرح کی بد کرداری سے بچنا ہے۔

مگر کیا امت مسلمہ ان خرابیوں سے بچ رہی ہے؟

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ (85)

"اس کے بعد (آج) تم ہی وہ لوگ ہو کہ اپنے ہی آدمیوں کو قتل کرتے ہو، اور اپنے ہی میں سے کچھ لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے ہو، اور ان کے خلاف گناہ اور زیادتی کا ارتکاب کر کے (ان کے دشمنوں کی) مدد کرتے ہو، اور اگر وہ (دشمنوں کے) قیدی بن کر تمہارے پاس آجاتے ہیں تو تم ان کو فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو، حالانکہ ان کو (گھر سے) نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب (تورات) کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو؟ اب بتاؤ کہ جو شخص ایسا کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیوی زندگی میں اس کی رسوائی ہو؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو سخت ترین عذاب کی طرف بھیج دیا جائے گا۔ اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔"

کیا آج امت مسلمہ جسد واحد کی طرح باہم شیر و شکر ہے؟

یا تفرقہ کا شکار ہے؟

کیا وہ باہم مددگار ہے؟

کیا وہ دشمنوں کی حلیف بن کر اپنے ہی مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہے؟

دوستی اور دشمنی کے معیارات کیا ہیں؟

بین الاقوامی قانون کس حد تک مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت میں مددگار ہے؟ کہاں کہاں خلا ہے؟ اسے کون اور کیسے پر کرے گا؟

☆☆☆☆☆

تعلیم وتربیت میں مثالوں کا پر تاثیر استعمال

خوش نصیبی ان کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی جنہیں ہادئ برحق بڑی محبت سے اپنے دست مبارک سے سیدھی لکیر کھینچ کر "صراط مستقیم" کی تعلیم وتربیت دے رہے تھے۔سیدھا راستہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف جاتا ہے۔پھر اس کے اطراف میں دائیں بائیں کچھ آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر فرمایا یہ وہ دیگر راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان بیٹھا ہوا ہے۔۔۔وہ لوگوں کو ان غلط راہوں کی طرف دعوت دے رہا ہے۔پھر اس مثال کو قرآن مجید کے فہم کا ذریعہ بناتے ہوئے اس آیت کی تلاوت فرمائی:

وَأَنَّ هَذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا فَاتَّبِعُوهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ "

(الانعام:۱۵۳)ترجمہ:اور یہ راہ ہے میری سیدھی سو اس پر چلو اور نہ چلو اور رستوں پر وہ تمہیں جدا جدا کر دیں گے۔(سنن الدارمی،باب فی کراھیۃ اخذ الرای،حدیث نمبر:۲۰۸)

وہاں خود خاتم الانبیاء والمرسلین دلنشین مثالوں سے تعلیم وتربیت فرمارہے تھے۔یہاں اب ہم ہیں جن تک یہ تفصیلات ذخیرہ احادیث کی صورت میں پہنچایا گیا۔اللہ ان سب کو جزائے خیر عطا کرے۔آمین۔ایک چشم تصور ہے جس میں ہر کوئی اپنی اپنی ذہنی سطح کے مطابق ان لکیروں کو پردہ خیال پر کھنچا ہوا ملاحظہ کر سکتا ہے۔چنانچہ اس مثال سے انسان کو راہ راست پر لانے کے لیے فطرت کو برموقع جگایا گیا ہے۔انسان کے اندر موجود "ضمیر" داعی کا فریضہ انجام دیتا ہے۔اسے جھنجھوڑتا ہے۔خارج سے قرآن مجید کی دعوت اسے راہ راست پر گامزن رکھنے کا اہم فریضہ انجام دیتی ہے۔

حدیث نبی میں صراط مستقیم کی ایک اور مثال:

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ محمد ﷺ نے فرمایا اللہ تبارک وتعالیٰ نے "صراط مستقیم" کی مثال ایسے راستے سے دی ہے جس کے دونوں طرف دیواریں ہیں۔ان دیواروں میں دروازے کھلتے ہیں۔ان دروازوں پر پردے لٹکے ہیں،راستے کے ایک سرے پر کوئی پکار رہا ہے۔راستے پر سیدھے چلتے آؤ،دائیں بائیں نہ ہونا۔پھر ایک اور متنبہ کرنے والا مقرر ہے،جب بھی کوئی انسان ان دروازوں میں سے کسی دروازے کو کھولنے کا

ارادہ کرتا ہے، وہ پکارتا ہے۔ تیری بربادی لازم ہے۔ اسے مت کھول۔ اگر تو اسے کھولے گا تو اس میں پھنس کر نقصان اٹھائے گا۔ پھر آنحضرت ﷺ نے اس کی تفسیر فرمائی: راستے سے مراد "اسلام" ہے۔ کھلے ہوئے دروازے سے اللہ تبارک و تعالی کی حرمتیں ہیں، (جن امور کو اللہ تعالی نے ناقابل عبور ٹھہرایا ہے) لٹکے ہوئے پردے اللہ تبارک و تعالی کی قائم کردہ حدود ہیں (انہیں پھلانگنے کی اجازت نہیں) راستہ (صراط) کے ایک سرے پر پکارنے والا قرآن ہے۔ ضمیر کی آواز اللہ تعالی کی طرف سے انسانی فطرت کا خاصہ ہے جو ہر قلب مومن پر دستک دے رہی ہے۔ (مسند احمد، باب حدیث النواس بن سمعان الکلابی، حدیث نمبر: ۱۶۹۷۶)

رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال میں "صراط مستقیم" پر چلنے کی ہدایت فرمائی ہے، آپ نے اس کے دونوں طرف دیواریں ذکر کیں۔ ان میں داخلے سے انسان حرام کا ارتکاب کرتا ہے، "صراط مستقیم" پر ان سے بچ کر ہی چلا جا سکتا ہے۔

سورۃ الفاتحۃ میں "صراط مستقیم" طلب کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ اس سورۃ میں انسان کو "مغضوب علیہم" اور "ضالین" سے بچ کر نکلنے کی دعا مانگنا بھی سکھایا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

"هدى للناس" البقرة:185

انسانی دماغ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ اور فکر میں غلطاں رہتا ہے۔ لیکن کبھی آپ غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ اس میں چلنے والی فکر بظاہر ایک بھی ہو لیکن مختلف ماضی کے واقعات اور پرانی اور نئی سوچیں اسے کہیں سے کہیں لیے پھرتی ہیں۔

اللہ تعالی نے قرآن مجید کو انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اس میں موجود آیات ٹھیک انسانی دماغ میں فکر کی رنگارنگی اور وحدت فکر کے مطابق تنوع لیے ہوئے ہیں۔

تفسیر موضوعی:

تفسیر موضوعی قرآن مجید کے مطالعہ کا ایک جدید باب ہے ۔ محمد الغزالی(1917-1996) نے قرآن مجید میں فقہ و تدبر کے لیے اس اسلوب کی طرح ڈالی۔ ان کا ھدف ہر قرآنی سورت کا مقصد سمجھنا اور جاننا تھا۔

تفسیر موضوعی کسے کہتے ہیں؟

اس کی زیادہ اچھی وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ بعض اوقات قرآن فہمی کے لیے ایک کلمہ مثلا" صبر "کو پورے قرآن میں جہاں جہاں موجود ہے ان آیات کو اکٹھا کر لیا جائے پھر ان کا مطالعہ کیا جائے۔ انہیں ایک دوسرے کی روشنی میں ان کے الفاظ اس میں بیان ہونے والی تراکیب اور احکام کو سمجھا اور بیان کیا جائے تو یہ تفسیر موضوعی ہو گی۔ تو جناب ایسا نہیں ہے۔

تفسیر موضوعی میں مفسر ایک مکمل قرآنی سورت کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ وضاحت کرتا ہے کہ اس کی تمام آیات چاہے سورت کے شروع میں ہوں یا آخر میں ہوں ایک دوسرے کی تائید اور تصدیق کرتی ہیں۔ وہ آیات کا آپس میں مخفی ربط بیان کرتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس سورت میں موجود تمام نکات سورج کی مانند روشن دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اس طرح وہ ایک سورت میں " وحدت موضوع " کو کھوجتا ہے۔ اس تفسیر کے نتیجے میں ایک سورت کی آیات کو ایک کُل کی صورت میں سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

موازنہ کاھنر اور تجارت

بچہ ہو جوان ہو یا بوڑھا ہر عمر میں اسے روزمرہ کی مختلف اشیائے ضرورت خریدنے اور بیچنے کا تجربہ ضرور ہوتا ہے۔
مال نقدی یا کوئی چیز دی جاتی ہے اور بدلے میں اپنی من پسند ضرورت کی شے لے لی جاتی ہے۔
خرید و فروخت میں انسانی عقل، اور سوجھ بوجھ کی پہچان بھی ہوتی رہتی ہے۔

سورۃ البقرۃ کی آیت 86 میں اللہ تعالی نے بنی اسرائیل کی اس عاقبت نااندیشی کو تجارتی زبان کے اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اللہ کے ساتھ پختہ عہد کرنے کے بعد توڑنے والے تورات کے بعض احکام کو چھوڑ کر بعض حصے پر ادھورا عمل کرنے والوں کی عقل کی پختگی اور پہنچ کا یہ عالم ہے کہ انہیں دنیا اور آخرت کا موازنہ کرنا نہیں آیا۔

دنیا جس کی زندگی عارضی ہے۔ جس کا عیش عارضی ہے جس کا غم عارضی ہے۔ جس کی نعمتیں عارضی ہیں۔ جس میں انسان عارضی ہے۔

اس کے مقابلے میں آخرت کی زندگی ہے۔ اس میں ناپائیداری کا خاتمہ ہو جائے گا۔ آخرت میں جنت اور جہنم دار خلود ہوں گے۔

جنت میں داخلے کے لیے تیاری دنیا کی زندگی میں کرنا ہے۔

ان کوتاہ عقلوں نے آخرت کی فلاح کو عارضی دنیا کے حصول کے لیے بیچ دیا اور گھٹیا چیز سے دل لگالیا۔ یہ کہاں کی عقل مندی ہے؟ اس سودے میں نقصان ہی نقصان ہے۔ اللہ رب العزت کا جہنم کی ہولناکی کے بارے میں ارشاد ہے:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (سورۃ البقرۃ:86)

"یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیوی زندگی کو آخرت کے بدلے خرید لیا ہے، لہذا نہ ان کے عذاب میں کوئی تخفیف ہو گی اور نہ ان کی مدد کی جائے گی۔"

اب یہ سودا بدلہ نہیں جاسکتا۔ کیوں کہ مہلت عمل کی جا دنیا تھی نہ کہ آخرت۔ اب جہنم کا عذاب نہ تو کم ہو گا اور نہ ہی کوئی شفیع و مددگار ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے آخرت کے حوالے سے با مقصد ہونا یوں بیان فرمایا: الدنیا مزرعۃ الآخرۃ: دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

آپ جو یہاں بوئیں گے اس کی فصل آخرت میں کاٹیں گے۔

☆☆☆☆☆

کیا کہا جارہا ہے؟

بیان کو جاننا یقیناً اہم ہے۔ تاہم بیان کے اصل مفاہیم سے شناسائی کے لیے ضروری ہے کہ یہ بھی معلوم ہو کہ مخاطب کون ہے؟ لہجہ کیا ہے؟ اور کس وقت کہا جارہا ہے؟

اللہ کریم نے قرآن مجید میں بنی اسرائیل کے کفر سے آگاہ کیا۔ فرمایا:

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ (البقرۃ:88)

"اور کہتے ہیں ہمارے دل پردے میں ہیں (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے پس ان میں سے تھوڑے ہی ایمان لاتے ہیں۔"

بنی اسرائیل نے دعویٰ کیا کہ ہمارے دلوں پر پردے ڈالے ہوئے ہیں۔ گویا ایسی پیکنگ میں ہیں کہ باہر سے کوئی چیز اندر داخل ہو کر ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔

اس بیان کی مخاطب نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ اور مسلمان تھے۔

ایسا کہہ کر وہ آپ کی نبوت ورسالت کو جھٹلا رہے تھے۔ وہ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ ان کے قلوب نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کو غیر صحیح جان کر اسے دھتکار دیا ہے۔

ان کی اس بے خبری کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: (بل لعنھم اللہ بکفرھم) یعنی قلوب کا اس حقیقت کے انکار کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام نشانیوں سمیت اس طرح پہچان لیا تھا جس طرح باپ اپنی اولاد کو جانتا ہے۔ تاہم کئی دنیاوی مفادات اور وجوہات کی بنا پر انہوں نے انکار نبوت کیا اور عذر یہ پیش کیا کہ ہمارے دلوں نے انہیں نہیں پہچانا۔ اللہ تعالیٰ نے اصل صورتحال واضح کی کہ جس چیز کو وہ اپنا تفاخر قرار دے رہے ہیں حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی سزا ہے اور وجہ ان کا کفر ہے۔ زیادہ تر بنی اسرائیل اسی طرح کے ہیں اگرچہ انہی میں سے چند ایمان والے بھی ہیں۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس چیز پر انسان اپنے بے جا فخر اور کبر کا اظہار کر رہا ہوتا ہے وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی ڈھیل، لعنت اور رسوائی ہوتی ہے۔ اللہ ہم سب کو ایسی ڈھیل سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

جب میرے پاس مال آجائے گا تو میں کسی کو غریب نہ رہنے دوں گا۔

جب میرے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری آجائے گی تو میں دین کی دعوت و تبلیغ اور بھی منظم انداز میں کروں گا۔

جب مجھے اپنے والدین کی خدمت کا موقع ملے گا تو میں دن اور رات کا فرق بھول کر ان کی خدمت کروں گی۔

جب میں خود ساس بنوں گی تو کبھی بہو پر ظلم نہ ڈھاؤں گی

وغیرہ وغیرہ

ایسے کئی عزم ہر انسان کرتا ہے۔ عزم کرتے ہوئے وہ ہمیشہ بلند و بانگ دعوے کرتا ہے۔

تاہم جب وہ حالات اس پر وارد ہو جاتے ہیں جن کی وہ خواہش اور انتظار میں تھا تو اب اس کا عمل اس کے دعوے کی قلعی کھول دیتا ہے۔

یہود بنی اسرائیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے کا انتظار کرتے تھے اور ان کا نام لے لے کر مشرکوں کے خلاف فتح کی دعا مانگتے تھے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمۡ كِتٰبٌ مِّنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمۡ ۙ- وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ۚ- فَلَمَّا جَآءَهُمۡ مَّا عَرَفُوۡا كَفَرُوۡا بِهٖ ۡ- فَلَعۡنَةُ اللّٰهِ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ (البقرہ:89)

اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب آئی جو ان کے پاس (موجود) کتاب کی تصدیق کرنے والی ہے اور اس سے پہلے یہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں کے خلاف فتح مانگتے تھے تو جب ان کے پاس وہ جانا پہچانا نبی تشریف لے آیا تو اس کے منکر ہو گئے تو اللہ کی لعنت ہو انکار کرنے والوں پر۔

تاہم حقیقت میں کیا ہوا؟ بنی اسرائیل کا دعویٰ اور انتظار دھرا کا دھرا رہ گیا اور وہ حسد کا شکار ہو کر خود اوس و خزرج کے مشرکوں سے بھی بد تر ہو گئے۔ قرآن مجید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہچان لینے کے بعد انکار یعنی کفر میں مبتلا ہو کر اللہ تعالیٰ کی لعنت خود پر واجب کرا لی۔

میرے لیے اس میں سبق ہے یقینا دعوی اپنے عمل سے پر کھا جاتا ہے۔

اور

جاننے پہچاننے کے بعد انکار کفر ہے۔ کفر کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت واجب ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ میرے اور ہم سب کے قول و عمل کے تضاد کو مٹانے کی توفیق دے۔ جانتے بوجھتے ہوئے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے دائرے سے باہر جانے کی غلطی سے بچنے کی توفیق دے۔ یقینا جان لینے کے بعد کفر کرنے والے پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

☆☆☆☆☆

نظام موت وحیات سے الحاد کارد

ہر فرد اپنے رویوں کا جائزہ لے۔

آپ باپ ہیں۔ اپنی اولاد کی نافرمانی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اللہ کی نافرمانی مثلا وعدہ خلافی۔ جھوٹ۔ قتل و غارت۔ قطع رحمی۔ دوسرے کے مال پر ناجائز قبضہ پر اپنی اولاد کو مجبور کرتے ہیں؟

آپ ایک ادارے کے سربراہ ہیں۔ کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ دن رات اپنے عمال سے مختلف کام لیتے رہتے ہیں۔ منتقم مزاج اس قدر کہ ان کی نافرمانی یا کام سے کوتاہی کی سزا میں ان کی روحوں اور جسموں کو روند ڈالتے ہیں۔

اسی تسلسل میں اللہ سبحانہ وتعالی کے دیئے ہوئے بہت سے انسانی حقوق کی پرواہ نہیں کرتے؟

اللہ پر ایمان رکھنے والے کبھی خود کو مقتدرِ اعلی منوا کر راستے سے منحرف ہوتے ہیں؟

حضرت ابراھیم علیہ السلام معلمِ ایمان بالغیب نے نمرود کا اپنے سلطنت واقتدار پر فخر وغرور کا مشاہدہ کیا۔ وہ خود کو "مُختارِ مطلق"

سمجھنے کی خطرناک غلطی میں مبتلا ہو چکا تھا۔ پوری دنیا پر حکمرانی نے اسے اس زعم میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ "حاکم مطلق" ہے اور کسی قانون کا پابند نہیں۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اسے رب کے قانون موت وحیات کی طرف متوجہ کیا تا کہ وہ اپنی غلطی سدھار لے۔ فرمایا:

رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِ وَ يُمِيتُ

"میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔"

نمرود اس نظام موت وحیات کی دلیل نہ سمجھا اور اسے سطحی بات سمجھ بیٹھا۔ کہنے لگا

قَالَ اَنَا اُحۡیٖ وَ اُمِیۡتُ

"تو اس نے کہا: زندگی اور موت دینا میرے اختیار میں (بھی) ہے۔"

اس کے اس نادانی پر مبنی جواب پر حضرت ابراھیم نے اسے اللہ کی توحید کا وہ رخ دکھایا جس کا جواب کسی ملحد کے پاس نہیں۔ فرمایا:

قَالَ اِبۡرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاۡتِیۡ بِالشَّمۡسِ مِنَ الۡمَشۡرِقِ فَاۡتِ بِهَا مِنَ الۡمَغۡرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیۡ کَفَرَ وَ اللّٰهُ لَا یَهۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ

"ابراہیم نے کہا: اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اسے مغرب سے نکال کر دکھاو، یہ سن کر وہ کافر مبہوت رہ گیا اور اللہ ظالموں کو راہ نہیں دکھاتا۔" سورۃ البقرۃ:258

اس طرح اس نے اللہ کے "اختیار مطلق" کو چیلنج کیا۔ بالآخر خود کو "قادر مطلق" سمجھنے والے کی موت ایک مچھر جیسے حقیر مخلوق سے ہوئی۔

بہت سے اہل ایمان نمرودی رویوں کے ذریعے خدائی کے دعوے دار ہیں۔ ذرا سوچیے کہیں آپ بھی ان میں سے تو نہیں۔

☆☆☆☆☆

عقائد کی بنیاد "استدلال" نہ کہ تقلید

ذات باری تعالیٰ کی معرفت کے لیے امام الناس حضرت ابراھیم علیہ السلام نے "استدلال" کی تعلیم دی۔ تلاشِ حق کے میں مشاہدہ اور عقل کی اہمیت تحقیق و تفتیش کا کوئی دوسرا منہج نہیں لے سکتا۔ حق کا کوئی متلاشی اس سے صرف نظر نہیں کر سکتا۔

سورۃ الانعام میں اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتا ہے:

اور ہم نے اسی طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات دکھائے تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔

ان مشاہدات کی ابتدا ایسے ہوئی:

فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ اللَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ (76)

"پھر جب رات نے اس پر اندھیرا کیا تو اس نے ایک ستارہ دیکھا، کہنے لگا یہ میرا رب ہے، جب وہ غائب ہو گیا تو کہا میں غائب ہونے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ (77)

"پھر جب چاند کو چمکتا دیکھا تو کہا یہ میرا رب ہے، جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگا کہ اگر مجھے میرا رب ہدایت نہیں دے گا تو میں ضرور گمراہوں میں سے ہو جاؤں گا۔"

فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّیْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (78)

"پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو کہا کہ یہی میرا رب ہے یہ سب سے بڑا ہے، پھر جب وہ غائب ہو گیا تو کہنے لگا اے میری قوم! میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم اللہ کا شریک بناتے ہو۔"

اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا ۚ وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (79)

"سب سے یکسو ہو کر میں نے اپنے منہ کو اسی کی طرف متوجہ کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، اور میں شرک کرنے والوں سے نہیں ہوں۔"

ان آیات پر غور کریں تو پتا چلے گا کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے یہ سارے سوال و جواب اور مشاہدے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے انجام دیئے۔لوگوں کو سکھایا کہ مخلوق کے ذریعے خالق کو سمجھنا آسان ہے۔ہر وہ نقص جو مخلوق کا عیب ہے خالق حقیقی اس سے مبرا ہے۔وہ تھکتا نہیں۔غافل نہیں ہوتا۔اس پر دھن طاری نہیں ہوتا۔وہ متغیر نہیں ہوتا۔کمزوری عاجزی کی نشانی ہے۔معبود کمزور نہیں ہو سکتا ورنہ وہ معبود نہیں۔یہ سکھایا کہ وہ تمام فوائد جو ان اجرام فلکی سے حاصل ہوتے ہیں در حقیقت اللہ تعالی کے "کن" کی بازگشت کے علاوہ کچھ نہیں۔یہ سب مخلوق ہیں خالق نہیں۔

☆☆☆☆☆

قلب (دل) اُذُن (کان) اَعیُن (آنکھیں)

آپ انہیں کس کام میں لاتے ہیں؟

عقل سے کام لینا، غور و فکر کرنا، تدبر کرنا، رائے رکھنا، شعور، وجدان، عقائد و نظریات رکھنا سب "دل" کی ذمہ داری ہے۔

کانوں کی ذمہ داری سُننا ہے تاکہ اطاعت ہو سکے۔

آنکھ کی ذمہ داری دیکھنا ہے تاکہ بصیرت پیدا ہو۔

قرآن مجید کی قریباً20 آیات ان تینوں وسائل علم و معرفت کا اکٹھا تذکرہ کرتی ہیں۔

اللہ تعالی ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۚ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۚ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ (سورة الاعراف:179)

"اور ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جن اور آدمی پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں مگر وہ ان سے سمجھتے نہیں، اور آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، اور کان ہیں مگر وہ ان سے سنتے نہیں، وہ اپنے ان رویوں میں چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گمراہی میں بڑھے ہوئے ہیں، یہی لوگ غافل ہیں۔"

☆☆☆☆☆

گزشتہ سے پیوستہ

کائنات کیا ہے؟

سورۃ الفاتحۃ نے "رب العالمین" کی تعلیم دے کر اللہ، انسان اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے کی ترغیب دی۔ اس کے ذریعے نظری، فکری اور عملی مسائل کو حل کرنے میں مدد ملنے کا کامل یقین ہے۔ یہ غور و فکر "تفہیم قرآن" کی اہم کڑی ہے۔ کائنات ایک بہت وسیع مضمون ہے تاہم اس کی ابتدا اسی "زمین" سے کرتے ہیں جس سے انسان کی تخلیق کی گئی۔ اس زمین سے جنمے ہوئے انسان سے اللہ تعالی کا مطالبہ "عمارتِ ارضی" کا ہے:

{ هُوَ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ } وہی ذات ہے جس نے بغیر کسی سابقہ مثال کے زمین سے تمہارا خمیر اٹھایا { وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا } اور تمہیں اسے بسنے کے قابل بنائے رکھنے کا حکم دیا۔(هود:61)

آیت میں "استعمرکم" میں انسانیت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اس زمین میں ہر طرح کی تعمیری سرگرمیاں اپنائیں۔اپنے لیے اور بعد میں آنے والے انسانوں کے لیے پودے درخت اور کھیتیاں اگائیں۔ان کے فائدے کے لیے عمارتیں بنائیں۔ہر وہ سرگرمی اپنائیں جس سے نہ صرف موجودہ انسان حیوان نباتات و جمادات فائدہ اٹھائیں بلکہ مستقبل کی مخلوق بھی اس سے فیض یاب ہوسکے۔یہ طلب مطلق ہے ۔یعنی اس طلب کو پورا کرنا انسانیت پر واجب ہے۔

ذرا سوچیے "کورونا" نے ہمیں بتادیا ہے کہ ہم اس فریضے کی ادائیگی میں کہاں کھڑے ہیں؟

"کورونا"۔۔۔۔ایک ایسی وبا جس کے خوف کے سائے تمام انسانیت کو متاثر کر گئے۔تاہم بعض بیدار مغز علماء و مفکرین نے اسے "جند من جنود اللہ"(اللہ کے لشکروں میں سے ایک لشکر) قرار دیا۔ایک ایسا لشکر جس نے اس جہانِ دنیا کو موجودہ اور مستقبل کی انسانیت کے لیے پھر سے رہنے کے لیے صحت مند مقام بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

چنانچہ(the earth is healing itself) جیسے تاثرات خبروں کی زینت بننے لگے۔انسانوں کو اپنے بہت سے ایسے کارہائے سیاہ کا اندازہ ہوا جس کے باعث دنیا میں زندگی عذاب کی ایک شکل بنتی چلی جارہی تھی۔

کورونا وبا کو کلی "مفسدت" قرار دینا تقریباناممکن ہے کیوں کہ اس وبا کی روک تھام کے لیے دنیا بھر میں کیے جانے والے لاک ڈاونز نے ہمارے دیکھنے کا رخ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا چنانچہ اللہ کریم کے اس ارشاد "لا تفسدوا في الارض"(زمین میں فساد مت پھیلاو) کو ایک بڑے کینوس پر دیکھنے اور محسوس کرنے کے مواقع ہر خاص و عام ،پیروجوان کو بالافراط ملے۔

جب انسانوں کو گھروں میں قید ہونا پڑا تو فضائیں صاف ہوئیں اور سموگ غائب۔درختوں پھولوں پودوں میں شگفتگی اور رنگینی میں اضافہ ہوا۔جانور اللہ کی بنائی ہوئی زمین میں آزادی سے چلے پھرے اور انہوں نے بھی دنیا دیکھی۔ہر قسم کی آلودگی میں کمی ہوئی۔ماحول نے صحت بھرا سانس لیا۔

انسان کا اس کائنات سے تعلق کتنا معنی خیز ہے؟اس کی تعلیم قرآن مجید کے ذریعے بآسانی ہر ایک کو دستیاب ہے۔اب یہ حضرت انسان کی ذمہ داری ہے کہ اس پر سوچے سمجھے۔کائنات کو جانے اوراس کے حقوق ادا کرے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاريات:56)

"اور میں نے جن اور انسان کو بنایا ہے تو صرف اپنی بندگی کے لیے۔"

عبادت کیا ہے؟

تذلل اور خضوع۔

"مکلفین"(عاقل بالغ اور فریضہ سے آگاہی اور اس کی ادائیگی کی استطاعت رکھنے والا مسلمان) پر ارکان اسلام کی پابندی عائد کی گئی ہے۔ نماز روزہ حج اور زکوۃ کے ذریعے انسان اللہ کی تعظیم بجالاتے ہوئے اپنی عاجزی وانکساری کا اظہار کرتا ہے اس لیے ان وظائف کو عبادت کہا جاتا ہے۔

اسلام میں عبادت کے معانی اس قدر وسیع ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی کی پوری روٹین عبادت میں شمار ہو سکتی ہے بشرطیکہ یہ اللہ تعالی کے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں گزرے۔

علماء کرام کی تحقیقات سے عبادت کی جو وضاحت کشید ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ

عبادت میں ہر وہ فعل شامل ہے جو اللہ رب العزت کو محبوب ہے۔ جس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔انسانوں کے لیے اللہ نے آسانی یہ کی ہے کہ ہر "قول" اور عمل چاہے "باطنی "ہو یا "ظاہری "عبادت ہے۔

چنانچہ

- نماز عبادت ہے،
- روزہ عبادت ہے
- صدقہ عبادت ہے
- حج عبادت ہے،
- سچی بات کہنا عبادت ہے
- امانت کی ادائیگی عبادت ہے

- ❖ والدین سے حسن سلوک عبادت ہے
- ❖ رشتہ داروں سے حسن سلوک عبادت ہے
- ❖ ایفائے عہد عبادت ہے
- ❖ نیکی کا حکم دینا اور منکرات سے روکنا عبادت ہے،
- ❖ کفار و منافقین سے جہاد عبادت ہے
- ❖ پڑوسی وہمسایہ سے حسن سلوک عبادت ہے
- ❖ یتیم، مسکین اور مسافر پر رحم کرنا اور حسن سلوک کرنا عبادت ہے
- ❖ غلاموں پر رحم اور آسانی کا معاملہ کرنا عبادت ہے
- ❖ جانوروں پر رحم کرنا عبادت ہے
- ❖ دعا مانگنا عبادت ہے
- ❖ ذکر کرنا عبادت ہے
- ❖ قراءت قرآن عبادت ہے
- ❖ اور اس طرح کے بہت سے " ظاہری اعمال "عبادت ہیں۔
- ❖ جہاں تک " باطنی عبادات " کی مثالیں ہیں تو:
- ❖ اللہ تعالی اور اس کے رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنا عبادت ہے
- ❖ ادل میں خشیت الہی ہونا عبادت ہے
- ❖ اللہ کی طرف رجوع کرنا عبادت ہے
- ❖ اخلاص دین عبادت ہے
- ❖ اس کے حکم پر صبر عبادت ہے
- ❖ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا عبادت ہے
- ❖ اس کی طرف سے آئی آزمائش کے باوجود راضی رہنا عبادت ہے
- ❖ اللہ پر توکل کرنا عبادت ہے

- ❖ اس سے رحمت کی امید رکھنا عبادت ہے
- ❖ اس کے عذاب کا خوف کھانا عبادت ہے۔
- ❖ عبادت اللہ سے محبت کی انتہاء اور اس کے سامنے عاجزی کی انتہاء کی صورت میں درجہ "کمال" حاصل کر لیتی ہے۔
- ❖ اسی طرح ہر وہ قول یا عمل جس کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل ہو عبادت ہے۔

☆☆☆☆☆

قرآنی ضرب الامثال

چھپے ہوئے معانی کی وضاحت مقصود ہو تو "تمثیل" کا اسلوب کارگر ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے "غائب" کا مشاہدہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اس طرح "معانی مقصودہ" قلوب میں بآسانی جاگزیں ہو جاتے ہیں۔

اللہ تعالی "ضرب الامثال" کی حقیقت خود بیان کرتا ہے:

وتلك الأمثال نضربها للناس وما يعقلها إلا العالمون (العنكبوت : 43)

"یہ مثالیں جو ہم لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں ان کی حقیقت کو تو علماء ہی بہتر طور پر جانتے ہیں۔"

سورۃ البقرۃ کی 17 ویں آیت میں اللہ سبحانہ و تعالی نے منافقین کے کردار کو ایک مثال کے ذریعے "مخاطب" کو سمجھایا ہے۔

مثال کی حکمت یہ ہے کہ مخاطبین کو "منافقانہ روش" سے باز رکھنے کی موثر تدبیر کی جائے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے:

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ

"ان (منافقین) کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے ایک آگ روشن کی پھر جب اس (آگ نے) اس کے ماحول کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کا نور سلب کر لیا اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا جہاں انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔"

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ان کی مثال یہ ہے جیسے ایک شخص نے آگ روشن کی۔ یہاں آگ روشن کرنے سے مراد منافق کا بحضور سرورِ کونین محمد صلی اللہ علیہ وسلم "ایمان باللہ و نبوت محمدی کا زبانی اقرار" ہے۔

فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَه

پھر جب اُس آگ نے سارے ماحول کو روشن کر دیا۔ یعنی مسلمانوں کے ساتھ نکاح و معاشرت کے فوائد اور اس کے ساتھ ساتھ مالِ فے میں سے حصے ملتے رہے۔

ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ

تو اللہ نے ان کا نورِ بصارت سلب کر لیا۔ یعنی مرنے کے ساتھ ہی اس زبانی اقرار کے فوائد بھی ختم ہوئے اور منافقت کے باعث آخرت کے اجر اور حسن خاتمہ سے محرومی مقدر ہو گئی۔

وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ

اور چھوڑ دیا ان کو ان اندھیروں کے اندر کہ وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ اب جب مہلت عمل ختم ہو گئی۔ قبر کے اندھیروں کے ساتھ آخرت بھی اندھیر ہو چکی۔

یہ مثال اُن کفار کی ہے جو اسلام کی روشنی پھیلنے کے باوجود اس سے محروم رہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر سو جہالت کی تاریکی تھی۔ انسانیت اندھیری شب میں بھٹک رہی تھی۔ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور انہوں نے آگ روشن کی۔ اس طرح ہدایت واضح ہو گئی۔ بُرا ہو ضد، تعصب، تکبر

اور حسد کا کہ ان برائیوں کے باعث بعض لوگوں کے اندر بصیرت و بصارت دونوں ختم ہو گئیں۔ وہ پہلے کی طرح اب بھی اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حقیقت کی آنکھ

اپنے ہاتھوں سے اگائی کھیتی کاشتکار کو بہت بھلی لگتی ہے؟ وہ اس کے لیے بہت قیمتی اور محبوب ہوتی ہے؟ یہ کون سی کھیتی ہے؟

وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْأَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ: "اور انجیل میں ان کی مثال یوں ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے نکالی اپنی کونپل، پھر اس کو تقویت دی، پھر وہ سخت ہوئی، پھر وہ اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔"

يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ: "یہ کاشتکار کو بڑی بھلی لگتی ہے"

جب سے اس آیت اور اس کے پس منظر کو تفاسیر اور سیرت النبی کی روشنی میں غور و فکر کر کے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ باغبانی کو دل چاہتا ہے۔ میرا شعور بھی بیج کے مٹی میں ملنے کے بعد ہوا پانی اور روشنی کے مناسب انتظام اور اللہ سے اس کے اگنے کی فریاد کر کے اس عمل کی حقیقت کو پالینا چاہتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم انسانوں پر رحم فرماتے ہوئے قرآن مجید میں مثالیں ایسی سادہ اور فطری زندگی سے دی ہیں جن کا مشاہدہ ہر خاص و عام اور بالغ و نابالغ بآسانی کر سکتا ہے اور نتیجتاً اس مقصد تک پہنچ جاتا ہے جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے مثال بیان کی۔

یہ "کھیتی "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں اور "کاشتکار" محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ذات عالی صفات و اخلاق ہے۔

مکہ مکرمہ میں نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دین اسلام کی تبلیغ کے بیج بوئے۔ تیرہ سالہ مکی دور میں دن رات کی پیہم کوششوں کے نتیجے میں قریباً 600 سے زائد لوگ مسلمان ہوئے۔۔۔

تھوڑا رکیے کاشتکار کا اپنی کھیتی سے لگاو اور اس کی بڑھوتری کے لیے محنت اور رب سے کی جانے والی مناجات کو محسوس کریں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔پھر ہجرت کی سختیوں اور آزمائشیں اٹھانے والوں کا رسول اللہ کی معیت میں ثابت قدم رہنے پر غور کریں۔۔۔۔۔

اب شروع ہوا چاہتا ہے کھیتی کی پیداوار دن دگنی رات چوگنی ہونے کا دور۔۔۔ مدینہ منورہ کے گیارہ سالہ دور میں صلح حدیبیہ میں مسلمانوں کی مضبوط پوزیشن اور مابعد لوگوں کا دین اسلام میں جوق در جوق شامل ہونے کا منظر نظر آتا ہے یہاں تک کہ ایک لاکھ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔

ذرا سوچیے اس کھیتی کا کون سا اور کتنا سا حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیارا ہو گا؟

اس کھیتی کے کاشتکار کی کامیابی کا کیا عالم ہے جسے اللہ نے پہلے "تورات" میں بطور مثال بیان کیا پھر "انجیل" میں اس کی مثال دی اور پھر "قرآن مجید" میں اس کی مثال دی جسے قیامت تک تلاوت کیا جاتا ہے۔

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاء عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاء بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ ذَلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الإِنجِيلِ كَزَرْعٍ أَخْرَجَ شَطْأَهُ فَآزَرَهُ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوَى عَلَى سُوقِهِ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُم مَّغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا

"محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں، اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں، وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں، (اور) آپس میں ایک دوسرے کیلئے رحم دل ہیں۔ تم اُنہیں دیکھو گے کہ کبھی رُکوع میں ہیں، کبھی سجدے میں، (غرض) اللہ کے فضل اور خوشنودی کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں۔ اُن کی علامتیں سجدے کے اثر سے اُن کے چہروں پر نمایاں ہیں۔ یہ ہیں اُن کے وہ اوصاف جو تورات میں مذکور ہیں۔ اور اِنجیل میں اُن کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک کھیتی ہو جس نے اپنی کونپل نکالی، پھر اُس کو مضبوط کیا، پھر وہ موٹی ہو گئی، پھر اپنے تنے پر اس طرح سیدھی کھڑی ہو گئی کہ کاشتکار اُس سے خوش ہوتے ہیں، تاکہ اللہ ان (کی اس ترقی) سے کافروں کا دل جلائے۔ یہ لوگ جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک عمل کئے ہیں، اللہ نے ان سے مغفرت اور زبردست ثواب کا وعدہ کر لیا ہے۔"

سورة الفتح:29

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ:اور میں نے جن اور آدمی اسی لئے بنائے کہ میری عبادت کریں۔(الذاریات:56)

گزشتہ پوسٹ میں ایک گھریلو عورت،ایک مزدور،ایک طالب علم،نوافل کے ذریعے اللہ کے قرب کے متوالوں،ایک تاجر،ایک والدہ اور ایک فلاحی کام کرنے والوں کے تصور عبادت کو بطور نمونہ سامنے رکھا تھا۔

مقصد عملی زندگی کے زندہ مسائل کو زیر بحث لانا ہے۔ایک مسلمان معاشرے میں رہتے بستے لوگ اسلامی تصور عبادت سے ناآشنائی کے سبب ضمیر کی خلش کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔

عبادت کیا ہے؟سوال آسان ہے اور جواب کے لیے جب تک قرآن مجید سے دوستی نہ کر لیں جواب مشکل ہے۔

بالکل آسانی چاہیں تو پھر اسے رسول اللہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ ضروری ہے۔

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیْرًا(الاحزاب:۲۱)

"بیشک تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ موجود ہے اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔"

☆☆☆☆☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

قرآن مجید کی بعض آیات اپنے نزول کی غرض وغایت اور مقصد خود بیان کر دیتی ہیں۔انہی میں سے ایک آیت یہ ہے:

وَ مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْن

"اور میں نے جن اور آدمی اسی لئے بنائے کہ میری عبادت کریں" **(الذاریات:56)**

اللہ ،کائنات اور انسان کا آپس میں تعلق ہمیشہ سے بے دار مغزوں کے غور و فکر کا مرکز رہا ہے۔

سورۃ الفاتحۃ کی ابتدا میں اللہ تبارک و تعالی نے اپنی ذات و صفات کو سادہ اور موثر ترین الفاظ سے متعارف کرایا۔ تعلق اور محبت کا احساس اجاگر کیا۔

"رب العالمین" بتا کر کائنات اور اس میں موجود تمام "مخلوقات" کے بارے میں غور و فکر کرنے اور معلومات بڑھانے کی تحریک دی۔

"مالک یوم الدین" میں اپنی وحدانیت اور اقتدار کے ساتھ ساتھ دنیا میں انسانی زندگی اور آخرت میں اس کے حساب کتاب کا بتا دیا۔

دن بھر کی پانچ نمازوں میں ہم ان عقائد کو دہراتے ہیں۔

لفظ "مخلوق" پر غور کرنا اہم ہے۔اپنی دنیا میں ہم عقلمند اور ناسمجھ سبھی انسانوں کے اعمال کا مشاہدہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام کے پیچھے اس انسان کا کوئی مقصد یا غایت ہوتی ہے۔

فیکٹریز سے بننے والی مصنوعات کسی نہ کسی ہدف کی تکمیل کے لیے بنائی جاتی ہیں۔

کھیتوں میں ہل کسی مقصد کے لیے چلایا جاتا ہے۔

گھروں کی تعمیر اپنے پیچھے بہت سی اہم وجوہات رکھتی ہے۔وغیرہ وغیرہ۔

اللہ سبحانہ تعالی علم و حکمت کا اصل منبع ہے۔اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔سورۃ الذاریات کی اس آیت میں اس نے "جن اور انسانوں کی تخلیق " کو دوسری مخلوقات کی تخلیق سے الگ کر کے ان کی تخلیق کے مقصد یعنی "عبادت " کی طرف توجہ دلائی ہے۔

جن و انس کو اللہ نے کچھ ایسا دیا جو بقیہ مخلوقات کو نہیں دیا۔

وہ کیا ہے؟

1۔ عقل، شعور اور ادراک

2۔اختیار کی آزادی

3۔عاقل و بالغ اور صاحب استطاعت ہونے پر شریعت کا مکلف

جی یہ سب دوسری مخلوقات کو نہیں ملا۔

اب "عبادت" کو سمجھنا ضروری ہے۔اس لیے کہ ہمارے خالق نے ہمیں عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور اس عبادت کے عمل کے لیے ضروری لوازمات یعنی عقل، اختیار اور وحی کے زریعے رہنمائی سے نواز دیا ہے اور اب امتحان ہے کہ عبادت کا حق کہاں تک پورا ہوتا ہے؟

☆☆☆☆☆

(وما ينطِقُ عَنِ الهَوَى * إنْ هُوَ إلاّ وَحْيٌ يوُحَى) (النجم : 3 ، 4)

"وہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ وہی بیان کرتے ہیں جو ان پر وحی کی جاتی ہے۔"

ترتیب توقیفی:

قرآن مجید نازل ہوتا رہا اور ہمارے آقا و مولا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کاتبین و حفاظ صحابہ کرام کو رہنمائی کرتے جاتے تھے کہ کس سورت کو کس سورت سے پہلے یا بعد میں رکھنا ہے کون سی آیت کس سورت میں کس آیت سے پہلے یا بعد میں ہو گی۔

قرآن مجید کلام الہی ہے۔اس کی موجودہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ رب العزت کے منشاء کے مطابق صحابہ کرام کو لکھوائی اور حفظ کروائی۔اسے قرآن مجید کی "ترتیب توقیفی" کہتے ہیں۔

"تفسیر موضوعی" میں ایک سورت کو کُل کی شکل میں مطالعہ کیا جاتا ہے۔یہ عمل اسی ترتیب توقیفی میں چھپے ثمرات کو سمجھنے اور آشکارا کرنے کی انسانی کوشش کا نام ہے۔

☆☆☆☆☆

مناسبت

مناسبت ہر کوئی تلاش کرتا ہے۔ گرم موسم میں پہنے جانے والے ٹھنڈے سوتی ملبوسات سردیوں کے لیے" نامناسب "ہوتے ہیں۔

شادیوں پر پہنے جانے والے زرق برق ریشمی اور نقشی دبکے کڑھائیوں والے بھاری پہناوے عام اوقات میں گھر میں پہننے کو "نامناسب" جانا جاتا ہے۔

مسجدیں اللہ تعالی کی عبادت کے لیے ہیں نہ کہ ڈھول پیٹنے اور رقص کے لیے۔

پاکستانی معاشرے میں شادی کے لیے "مناسب" جوڑی چھوٹی عمر کی لڑکی کے ساتھ عمر میں اس سے بڑے مرد کا جوڑ مناسب جب کہ چھوٹی عمر کا لڑکا اور عمر میں اس سے بڑی لڑکی "نامناسب" سمجھی جاتی ہے۔

رشتہ دار امیر ہوں تو ان سے گہرے تعلقات کو "مناسب" اور غریب ہوں تو ان سے دوری کو "مناسب" جانا جاتا ہے۔

بڑی عمر یا بڑے عہدے پر موجود شخصیت کی ہر بات کو "مناسب" اور نو عمری یا غربت میں فکر و تدبر کی گفتگو کو "نامناسب" سمجھا جاتا ہے۔

لوگوں کی توجہ کے لیے کسی گدی نشین کی کشف و کرامات سے مزین طلسمی گفتگو "مناسب" مگر قرآن و سنت کی تعلیمات کو زندگی پر منطبق کرنے کی گفتگو "نامناسب" سمجھی جاتی ہے۔

اس میں سے کچھ باتوں پر آپ کو اتفاق اور کچھ سے اختلاف ہو گا۔۔۔

لیکن شاید اس بات سے آپ اتفاق کریں گے کہ "مناسبت کی تلاش" صاحب عقل ضرور کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

اسلام کا تصور آزادی

ایک فرد کلمہ طیبہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" پڑھ کر اسلام لے آتا ہے۔ یہ کلمہ انسان کو اس کے حقیقی خالق کی پہچان کراتا ہے اور اسے ہر غیر فطری غلامی سے آزاد کر دیتا ہے۔ وہ صرف اللہ کا بندہ ہے۔

وہ کسی کا غلام نہیں۔ مظاہر فطرت، حجر و شجر، انسان و جنات سب کے سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ کلمہ توحید کا اقرار کرنے والا ان میں سے کسی کا بندہ نہیں۔ اسے اپنا سر صرف اور صرف بارگاہ الہی میں جھکانا ہے۔

ہمارے آقا و مولا رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے 9 ذوالحجہ یوم النحر میں خطبہ حجۃ الوداع میں انسانی آزادیوں کی بھرپور وضاحت فرمائی اور کھلے الفاظ میں اعلان فرما دیا:

اے لوگو تمہارا رب ایک ہے۔ تمہارا باپ ایک ہے۔ تم سب کے سب آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر اور نہ ہی لال کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل ہے مگر تقویٰ کے سبب۔ **(مفہوم حدیث)**

مخلوق ہونے کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ کوئی اپنے نسب کی بنا پر دوسروں کا محکوم نہیں بنا سکتا۔

کوئی اپنے رنگ کے باعث دوسروں پر حاکم مقرر نہیں ہو گیا

کوئی اپنی قوت کے بل بوتے پر دوسرے انسانوں کو اپنے زیر نگین نہیں کر سکتا۔

اس آزادی کا اعلان اللہ رب العزت نے اس آیت میں فرمایا:

لَمْ يَكُنِ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ مِنْ أَهْلِ ٱلْكِتَـٰبِ وَٱلْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتَّىٰ تَأْتِيَهُمُ ٱلْبَيِّنَةُ (سورة البينة:١)

"اہلِ کتاب میں سے کافر اور مشرک لوگ باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ ان کے پاس کھلی دلیل آئے."

علال فاسی مقاصد شریعت پر عمیق نگاہ رکھنے والی شخصیت، آزادی کا قرآن و سنت سے اثبات کرتے ہوئے آیت میں موجود لفظ "منفکین" کا ترجمہ اسیری سے رہائی یعنی آزادی کا کرتے ہیں۔ انہیں مفسرین کرام پر تعجب ہے کہ وہ اس لطافت کو محسوس نہ کر سکے اور اس کا مطلب "باز آنے والے"، "رکنے والے"، "اختتام کرنے والے" کرتے آئے ہیں۔ اگر مخلوق کو یہ صدا نہ سنائی جاتی تو انسان اپنے سے زیادہ طاقت ور کا غلام رہتا۔ آزادی کا یہ پیام اللہ کے آخری نبی و رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانیت کو پڑھ کر سنایا۔

☆☆☆☆☆

آپ کو تعریف سننا پسند ہے؟

تعریف سننا سب کو اچھا لگتا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ لوگ اس کی تعریف کریں۔ کچھ لوگ تعریف کے لیے بال سنوارتے رہتے ہیں۔ کچھ کپڑوں کے نت نئے ڈیزائن پہن پہن کر داد وصول کرتے ہیں۔

بہت سوں کو نئی چمکتی دمکتی کار کی تعریف سنناپسند ہوتی ہے اور کچھ محلات بنا کر انہیں جنت سماں بنا کر ان پر اتراتے پھرتے ہیں۔ بعضے سنجیدہ مزاج اور اعلی تعلیم اسناد اور عہدے حاصل کر کے تعریف سمیٹتے ہیں۔ غرض ہر کسی کو ستائش اچھی لگتی ہے۔

توکیا آپ نے قرآن مجید میں یہ آیت پڑھی ہے؟

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

ترجمہ:

"ان کے متعلق ہر گز نہ سمجھنا جو اپنے کاموں پر خوش ہوتے ہیں اور جو یہ پسند کرتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے ان لوگوں کے متعلق ہر گز یہ گمان نہ کرنا کہ وہ عذاب سے نجات پا جائیں گے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔"

ہر انسان اپنی کارگزاری پر تعریف حاصل کرنا چاہتا ہے چنانچہ مفسر قرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے اس آیت اور انسانی رویے کے بارے میں پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کا اس آیت سے کیا تعلق ہے؟ یہ آیت تب نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود سے کوئی سوال پوچھا تو انہوں نے اصل جواب چھپالیا اور کچھ اور جواب دے دیا اور اب اپنے اس بد عمل کے باوجود پر اپنے نمازی و روزہ دار ہونے کی تعریف بھی سننا چاہتے تھے۔ **(مفہوم حدیث۔ صحیح بخاری۔ رقم حدیث 4568)**

گویا حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ خاص یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے۔ اگرچہ یہ آیت عام نہیں ہے لیکن عقلمند انسان دوسروں کو دیکھ کر درس عبرت لے لیتا ہے۔ مجھے اور آپ کو اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ جو کام ہم نے سرانجام ہی نہ دیا ہو اس پر تعریف کے طلبگار ہوں۔

ابن عاشور اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کے اخلاقی انحطاط اور تبلیغ دین میں کوتاہی پر دلالت کرتی ہے۔ بخاری کی ایک روایت میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت غزوات سے جان بوجھ کر پیچھے رہ جانے والے "منافقین" کے لیے اتری جو بعد میں عذر پیش کر دیتے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذر قبول فرمالیتے۔ اب وہ منافقین اپنی تعریف کے لیے مجاھدین کہلانا چاہتے تھے۔

ابن عاشور نے تفسیر بالماثور پیش کرنے کے بعد یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیت میں موجود خطاب ہر اس شخص سے کیا گیا ہے جس کا حال اس بد اخلاقی سے مزین ہے۔

اسی موقع پر جان لینا بھلا معلوم ہو گا کہ دن بھر کئی مرتبہ نمازوں میں سورۃ الفاتحۃ کی تلاوت میں جب ہم (الحمد للہ رب العالمین) کہتے ہیں تو ہم اس حقیقت کو اپنی زبان سے ادا کرتے ہیں کہ اصل میں تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ ضرورت اسے سمجھنے کی اور بندگی اختیار کرنے کی ہے۔ اللہ ہم سب کو اس کی توفیق دے۔ آمین

☆☆☆☆☆

تخیل کی آبیاری

اللہ رب العزت نے انسان کو راہ ہدایت سجھانے کے لیے قرآن مجید نازل فرمایا۔ اس ہدایت کے انداز اور رنگ ہر لحہ ہر آن نئی جوت وجدت لیے نظر آتے ہیں

تلاوت کا آغاز کیجیے۔

سورۃ الفاتحۃ کی پہلی ہی آیت کسی بھی ذہن کو مہمیز کیے بنا نہیں رہتی۔ یہ انسانی تخیل کو آزاد پرواز کی راہ دکھاتی ہے۔ سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔

الحمد للہ رب العالمین

(سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو جہانوں کا رب ہے)

انسان اپنے رب کا تعارف حاصل کرتا ہے "عالمین کا رب"۔ تلاوت کرتے ہی پہلا خیال ابھرتا ہے۔ میرا رب کون ہے؟ کیسا ہے؟ ابھی یہ خیالات جاگتے ہیں کہ "رب العالمین" کے کلمات اسے تخیل کی بلند پروازی کی دعوت دیتے ہیں۔ کلام الٰہی اس کی اس الجھن کے حل کی محفوظ راہ سجھاتا ہے۔ ذات الٰہی کے بارے میں جاننا ہے تو پہلے اس کی تخلیق پر نگاہ کرو۔

کیا تم نے اس کا بنایا ہوا کوئی ایک عالم بھی دیکھا ہے؟

اور

وہ تو تمام عالموں کا رب ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کی وسعتوں پر نظر ڈالو۔ اس کی کاریگری کو دیکھو۔ وہ ستارے وہ سیارے۔ یہ زمین و آسمان۔ نگاہ بلند پرواز سے قاصر ہے تو چلو اس زمین سے آغاز کرو۔ ان پھولوں کو دیکھو جن کے لاتعداد رنگ، حجم، قسمیں اور خوشبوئیں ہیں۔ محض ایک زندگی میں صرف کرہ ارضی میں موجود پھولوں کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا ہی مشکل ہے۔

ذرا دریاؤں اور سمندروں میں موجود مچھلیوں کی رنگا رنگ قسموں بولیوں جسمانی نقش و نگار اور جسامت کے بارے میں سوچو۔۔۔ معلوم ہو گا کہ اس کرہ ارضی کے اندر بھی اتنے جہان آباد ہیں جن کی خبر رکھنے کے لیے ایک حیات ناکافی ہے۔۔۔ انسان کی زندگی ختم ہو جائے گی مگر اس ماہر خلاق کی تخلیقات سے کامل آشنائی ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ عالمین پر یہ توجہ انسان کو ایک طرف "رب کی کبریائی" کا احساس دلائے گی تو دوسری جانب اتنی بڑی کائنات میں اپنے وجود کی کم مائیگی کا احساس " عجز کی رغبت " دلائے گا اور اپنے اصل خالق و مالک کی عظمت اور ربوبیت کی قدر آنے لگے گی۔

یہ تمام باتیں اپنی جگہ ذرا سوچو ایک انسان جو اپنے جیسے ہی ایک انسان کی غلامی میں ہے۔ اس پر راج کرنے اور اپنے لیے خدمات بٹورنے کے لیے اس کا یہ مالک اسے علم کی نعمت سے محروم کرتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ غریب انسانوں کی پیدائش کا مقصد اپنے انسانی آقاوں کی بندگی اور خدمت بجالانا ہے۔ اسے سوچنے اور غور و فکر کرنے والا خادم سخت ناپسند ہے۔ اور کیوں نہ ہو کہ بیدار مغز پر حکومت کرنا آسان نہیں۔

دوسری طرف رب کائنات اللہ تبارک و تعالی ہے جو اپنی تعریف بجالانے کی تعلیم دے رہا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ انسان کو "فکری آزادی" کی نعمت سے نواز کر حق بندگی کا تقاضا کر رہا ہے۔

سوچو، غور و فکر کرو، سمجھو۔

اس کے فرستادہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق "ایک فقیہ ہزار عابدوں پر بھاری ہے"۔ **(مفہوم حدیث)**

☆☆☆☆☆

آیئے غور و فکر کرتے ہیں

شیر خوار بچہ جب بڑا ہونے لگے تو کیا اسے ٹھوس غذا کی ضرورت ہوتی ہے؟جی بالکل اور تمام لوگ اس کی ضرورت کو درست جانتے ہیں

تعلیم کے سلسلے میں جسے لفظ بولنے آجائیں اسے جملے سکھائے جاتے ہیں۔جملوں سے پیراگراف اور پھر مضمون نویسی اور کہانیاں بھی لکھوائی جاتی ہیں۔کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سرگرمی غلط ہے ۔کسی لفظ کی ادائیگی ہی کافی ہے؟نہیں یہ درست نہیں۔

بیماری مہلک تھی۔طبیب نے مہینے چھ مہینے جو دوادی بعد میں مرض کی نوعیت میں کمی مشاہدہ کر کے دوا کی تجویز بدل دی۔آپ اسے طبیب کی مہارت مانیں گے یا دوا بدلنے پر اسے جاہل سمجھنا شروع کر دیں گے؟ایسا کوئی بھی نہیں سمجھتا۔

والد صاحب گھر بھر کی ضرورتوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔انہیں اپنی ساری اولاد سے بہت محبت ہے۔اس کا وہ زبانی اور عملی اظہار کرتے رہتے ہیں لیکن یہ کیا جب وہ کسی بات کو ٹھان لیں تو پھر انہی کی ماننا پڑتی ہے۔کیا والد صاحب کی اولاد سے محبت افسانہ ہے؟وہ انہیں دکھی کرنا چاہتے ہیں یا اپنی حاکمیت کا رعب جمانا چاہتے ہیں؟مسئلہ محبت اور حکم کی حدود کو متعین نہ کرنے کا ہے۔

کتنی عجیب روش ہے کہ جب ایک جماعت کے مضامین سے شناسائی ہو جاتی ہے تو بجائے اس کے کہ ہمیشہ اسے ہی دہرایا جائے اگلی جماعت میں ترقی کر دی جاتی ہے۔کیا پچھلی جماعت کی تعلیم ناقص تھی؟

مقصد تو اللہ کی بطور معبود پہچان حاصل کرنا ہے۔ہر نبی نے توحید سکھائی اب آپ نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء والمرسلین کی بعثت کے بعد پچھلے انبیاء کی تعلیمات کو چھوڑ دیا۔کیوں؟کیا آپ انہیں غلط یا ناقص جانتے ہیں؟کیا یہ عمل اللہ کی شان کے مطابق درست ہے؟

یہ اور کئی ایسے سوالات ہمارے ذہنوں میں کلبلاتے ہیں۔

جی ہاں۔ان سب مثالوں میں موجود سوالات پر غور و فکر اور ان کے درست جواب کی تلاش "صراط مستقیم" پر محفوظ سفر کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

"معلوم سے نامعلوم تک رسائی"

معلوم سے نامعلوم تک رسائی علم التعلیم کے بنیادی اصولوں میں سے اہم اصول رہا ہے۔ دنیا بھر میں جتنے بھی علوم پڑھائے اور سکھائے جاتے ہیں ان سب میں یہ اصول ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتا ہے۔

اللہ تعالی کے بھیجے ہوئے قریبا ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل نے انسانیت کو توحید کی ہدایت اور تعلیم کے لیے یہی اصول اپنایا۔ اس تعلیم کے لیے حضرت ابراھیم علیہ سلام کے طریقہ کو اللہ سبحانہ وتعالی نے قیامت تک کہ لوگوں کی رہنمائی کے لیے قرآن مجید کی آیات میں محفوظ کر لیا۔

وہ تمام انسان جو "مشاہدہ" کی اہمیت کو جانتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ مشاہدے سے درست نتائج کے لیے طویل وقت، غور و فکر، تحلیل و تجزیہ کے ساتھ ساتھ نفسیاتی ضروریات پسند و ناپسند قابلیتیں اور ہنر کے علاوہ رد عمل کی نفسیات پر عبور بھی ضروری ہے۔

حضرت ابراہیم نے "توحید خالص" کی تعلیم اور ذات باری تعالی کے اثبات کے لیے جس مشاہدے کی روش اپنائی اللہ تعالی نے اسے تفصیل سے سورۃ الانعام میں بیان کر دیا ہے۔ حق کے متلاشی ان آیات کو پڑھ کر سمجھ کر "ایمان بالغیب" کو مزید سیکھ لیں گے اور اپنے ایمان پختہ کرنے کا سامان کریں گے۔

☆☆☆☆☆

نظر، عینک اور کلام الہی

ذرا سوچیے آپ کی نظر کمزور ہے لیکن آپ نے اپنے والد یا والدہ کی عینک لگالی ہے تو نمبر کی تبدیلی کے باعث مزید دھندلا نظر آنے لگا۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔

پہلے ہی سخت اندھیرا تھا ظالم دوست نے عینک سے مراد محض فریم لیا اور اس کے سیاہ شیشوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مکمل اصرار کیا کہ فکر نہ کرو جب سخت دھوپ ہو گی تو یہ منظر حسین دکھائے گی۔

آپ دور دیکھنا چاہتے ہیں اور آپ کو عینک میں ایسے شیشے فٹ کر کے تھما دیا گیا ہے جس میں قریب کی چیزوں کو صاف اور بڑا دیکھنا تو ممکن ہے دور کے لیے کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

آپ کو قریب سے صاف دیکھنا ہے مگر تحفے میں دور دیکھنے کی عینک دی گئی ہے اور آپ اس مقدس تحفے کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتے۔

ارے یہ کیا دنیا تو ساری پیلی ہے!

نہیں نہیں ساری دنیا نیلی ہے!

سبز ہے سبز ہے!

سرخ ہے سرخ ہے!۔۔۔

ارے جس رنگ کے شیشے آنکھوں پر لگاوگے۔ دنیا اسی رنگ کی دکھے گی نا۔۔۔

مگر یہ کیا؟

آپ کی نظر کمزور ہے لیکن اس کے لیے ذاتی عینک نہیں خریدنا چاہتے!!!

آپ کا منصوبہ ہے کہ

گھر میں والدین کی عینک،

مدرسہ میں اساتذہ کی عینک،

یار دوستوں میں انہی کے چشمے،

بچوں بچونگڑوں میں ان کی رنگ برنگی موٹے پتلے شیشوں والے مختلف گاگلز سجا کر بہترین گزارا ہو جائے گا۔۔۔

وقت کٹ جائے گا۔۔۔

کلام الٰہی کی زبان عربی

اور

مجھے عربی نہیں آتی۔۔۔ کبھی کسی عالم کا ترجمہ قرآن، کبھی کسی عالم کا ترجمہ قرآن۔۔۔ میری ضرورت ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نے ترجمہ کیا۔۔۔

اس کی علمیت،

زباندانی کی مہارت،

ماحول کی ضروریات،

تبلیغ کا شوق یا عدم شوق،

مزاج کی شدت یا سہل پسندی۔۔۔وغیرہ وغیرہ اس کے ترجمے میں شامل ہو چکی ہے۔۔۔۔ مختلف عینکوں کی طرح اس میں بھی کوئی ایک وصف یعنی دور یا پاس دیکھنے، چھاوں یا رنگ دیکھنے کی صلاحیت ہے۔۔۔۔ وقتی طور پر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔۔۔۔۔

کیونکہ آپ مختلف ہیں۔

مسئلہ کلام الٰہی میں نہیں۔ مسئلہ ایسی اپروچ کا ہے جس میں محتاجی ہے۔ ایسی صورت میں کلام الٰہی کا ترجمہ آپ کی زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔

کسی اور کی نظر سے، کسی اور کے ذہن سے پڑھیے اور سمجھیے اور سر دھنیے۔ شخصیت پرستی اور فرقہ پرستی کی راہیں ہموار کیجیے۔ اس میں اس ترجمہ کرنے والے کا قصور نہیں۔ قصور محتاج اور اپاہج کا ہے۔

اپنی نظر سے دیکھیے اپنے فہم سے جانیے سوچیے سمجھیے۔ کلام الٰہی کی زبان عربی سیکھیے اس سے محبت کیجیے۔ اس سے بلاواسطہ، قریب کی دوستی کر لیجیے۔ اسے اپنی آنکھ سے دیکھیے اپنے فہم سے سمجھیے۔ محتاجوں تک پہنچائیے۔۔۔

جسے قبر میں، پل صراط پر، روز محشر، جنت میں رفیق اور دل کی بہار بنانا چاہتے ہیں آپ کے اور اس کے درمیان بہت سے واسطے آگئے ہیں۔۔۔ حجاب بڑھ گئے ہیں۔۔۔ ان کو دور کرنے کی تیاری کے لیے وقت ہے آپ کے پاس؟؟؟

ہے تو مبارک ہو

(خیرکم من تعلم القرآن وعلمه) خوشخبری آپ کے لیے

وقت نہیں ہے تو جتنے لمبے واسطے ہیں اتنی دوری سے کرم کے منتظر رہیے۔۔۔ اللہ کریم ہے۔ رحیم ہے۔ معاف فرمانے والا ہے۔ بس آپ کے پاس اپنی سستی کی حجت کوئی نہیں۔ دلیل کوئی نہیں۔۔۔

بتائیے ہے آپ کے پاس؟

اللهم صل علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنامحمد و صل علی المومنین والمومنات والمسلمین والمسلمات۔

☆☆☆☆☆

سوچیے غلبہ واقتدار چاہنے والا اپنا تعارف کس طرح کراتا ہے؟

عام مشاہدہ ہے کہ

طاقت کے اظہار سے۔۔۔

قہر اور جبر سے۔۔۔۔

یہاں تک کہ سامنے والا بے یاری و مددگاری اور بے بسی اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے۔

سورۃ الفاتحۃ میں اللہ تبارک و تعالی نے اپنے تعارف کی ابتدا اسم ذاتی "اللہ" سے کی پھر اپنی صفت "ربوبیت" کو مشاہدہ کرنے کے لیے عالمین کی طرف توجہ مبذول کرائی تا کہ ہیبت اور ڈر دُوری پر نہ اُکسائے۔اس پر اضافہ فرمایا:

الرحمن الرحیم۔

"(جو رحمن ہے رحیم ہے۔)"

دونوں صفاتی نام "رحمت" کی خبر دیتے ہیں۔احادیث و روایات اللہ کی صفت "رحمن " کو تمام مخلوقات پر رحم کرنے والا بتاتی ہیں۔یہاں تک کہ مسلم و غیر مسلم میں بھی فرق نہیں۔"رحمن"کا نام مخلوق کو اپنے لیے رکھنا روا نہیں۔

دوسری صفت "رحیم"ہونا ہے۔رحیمی ایک عمل ہے۔رحمت کا ایک سلوک ہے۔اللہ تعالی خود بھی رحیم ہے اور اس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصف "رحیم"کا تذکرہ بھی قرآن مجید میں فرمایا۔گویا انسان بھی رحیم ہو سکتا ہے۔

احادیث سے پتا چلتا ہے کہ اللہ کی صفت "رحیم "کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں سے ہے جس کا مظاہرہ قیامت کے دن ہو گا۔

اس نے اپنے رحمن ہونے کی صفت کو تذکرہ کر کے مخلوق سے محبت و شفقت کے تعلق کو پہلی ترجیح میں رکھا ہے۔۔۔۔ غور و فکر کریں۔۔۔

اللہ کو اس رویے کا پابند کرنے والا کون ہے؟ جب کہ وہ قادر مطلق ہے۔

"اسلام کی دعوت و تبلیغ" کی ذمہ دار "امت مسلمہ" کے ہر فرد کو یہی اخلاق اپنانے کی ضرورت ہے۔ دین کی تبلیغ کے لیے اپنے اندر صفت "رحیمیت" کو پروان چڑھائیں۔ یہ صفت انسانوں کے درمیان اچھے تعلقات، امن کے فروغ، ہمدردی، رواداری، بھلائی اور فلاح کے کاموں میں تعاون کے ذریعے نہ صرف دنیا میں صحت مند اسلامی معاشرے کے فروغ میں مددگار ہوگی بلکہ آخرت میں بھی اللہ تعالی کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے میں مددگار ہوگی۔

اللہ تعالی ہمیں خود میں اور اپنے بچوں میں "رحیمیت" کی خوبی پروان چڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆

"قرآن کا تعارف انسان:"

"انسان" اس کائنات میں خوش نصیب ترین مخلوق۔ مسجود ملائک۔ احسن تقویم پر تخلیق کردہ۔

اللہ نے اس کے لیے زمین و آسمان اور ان کے اندر سب کچھ اس کے لیے مسخر کر دیا۔

عقل کا نور دیا۔

وحی سے کامل رہنمائی فراہم کی۔

اختیار کا کارگر ہتھیار دیا۔

حریت کا تاج پہنایا۔

علم سکھایا۔ بیان سکھایا۔

اور

سب سے بڑا اعزاز یہ کہ زمین پر اپنا نائب مقرر کیا۔ خلافت ارضی بخشی۔

اس قدر اہتمام کس لیے؟

کبھی اس رحمن ورحیم کی ان عطاوں پر تدبر کیا؟ کبھی ان کے درست استعمال کا منصوبہ ترتیب دیا؟

☆☆☆☆☆

"حاکم" کون ہے؟

"حکم" کیا ہے؟"

الہامی مذاہب سے تعلق رکھنے والا ہر فرد جسے خاتم الانبیاء والمرسلین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت ورسالت کی اطلاع مل چکی ہے اور وہ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکاری ہے۔

یا

وہ جو اسلام کو دین برحق ماننے سے راہ فرار اختیار کرتا ہے۔

یا

وہ جو چند انبیاء کو تو من جانب اللہ مانتا ہے اور بقیہ کا انکار کرتا ہے۔

یا

وہ جو رسول اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت ورسالت کا اختتام ماننے سے انکاری ہے

یا

وہ جو "اسلام" کے علاوہ کسی بھی انسانی تحریف و تبدیلی کو "دین" سمجھتا ہے

اور

وہ جسے "اسلام" کے مِن جانبِ اللہ ہونے اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آخری نبی ورسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک ہی دین ہونے میں شک ہے۔

تو

حقیقت یہ ہے کہ اسے اپنے عقیدہ توحید کو درست اور خالص کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

توحید کیا ہے؟اس کی خالص سمجھ بوجھ قرآن مجید میں مذکور حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ کرنے والے واقعہ سے ہوتی ہے۔

آدم کیا ہیں؟

اللہ تعالی کی مخلوق۔

فرشتے کیا ہیں؟

اللہ تعالی کی مخلوق۔

جن کیا ہیں؟

اللہ تعالی کی مخلوق۔

سجدہ کیا ہے؟

ایک عبادت جو صرف اللہ تبارک و تعالی کے لیے ہے۔

ہوا کیا؟ اللہ تعالی نے اپنی ایک مخلوق یعنی فرشتوں کو اپنی دوسری مخلوق یعنی آدم علیہ السلام کو "سجدہ" کرنے کا "حکم" دے دیا۔۔۔

یہاں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ کی وہ نور سے بنائی مخلوق ہیں جنہیں اللہ نے "اختیار" کی نعمت سے نہیں نوازا۔ وہ اپنے رب کا حکم سن کر پس و پیش نہیں کرتے۔ بس وہی کچھ کرتے ہیں جس کا الہی حکم انہیں ملتا ہے۔

دنیا میں جن و انس کو نکال کر بقیہ تمام مخلوق کو "اختیار" کی نعمت نہیں دی گئی چنانچہ وہ جس کام کے لیے پیدا ہوئے ہیں بغیر رکے اور تھکے وہ کام انجام دیتے رہتے ہیں۔

ابلیس جن تھا جسے اللہ تعالی نے آگ سے تخلیق کیا زہد و عبادت کی کثرت سے وہ فرشتوں کی جماعت کا سربراہ بن چکا تھا۔ وہ "اختیار" کی نعمت سے بہرہ ور تھا لیکن اس کی عبادت کی کثرت اسے "اختیار" کو درست استعمال نہ کرا سکی۔ اس نے انسان کے عنصر تخلیق یعنی مٹی اور جن کے عنصر تخلیق: آگ کا تقابل کیا اور خود کو برتر جانا۔۔ اس نے حکم دینے والے کے مقام کو نظر انداز کرتے ہوئے آدم کے لیے "سجدہ" کرنے کو غلط جانا۔ خطرناک غلطی جو موجب کفر و ضلالت بنی وہ "حکم الہی" کا پاس نہ رکھنا تھا۔ چنانچہ راندہ درگاہ ہوا۔

نبوت و رسالت "الہی حکم" ہے۔ اللہ کا فضل ہے۔ ایسی عطا ہے جو مخصوص چنیدہ و برگزیدہ انسانوں پر ہوئی۔ کوئی بھی انسان یا جن کثرت عبادت، زہد تقوی یا علم کی کثرت سے اس وہبی فضل کو حاصل نہیں کر سکتا۔ کوئی اللہ سے کیوں؟ کا سوال نہیں کر سکتا۔

☆☆☆☆☆

نظر، عینک اور کلام الہی

ذرا سوچیے آپ کی نظر کمزور ہے لیکن آپ نے اپنے والد یا والدہ کی عینک لگالی ہے تو نمبر کی تبدیلی کے باعث مزید دھندلا نظر آنے لگا۔ آنکھوں کے آگے تارے ناچ گئے۔

پہلے ہی سخت اندھیرا تھا ظالم دوست نے عینک سے مراد محض فریم لیا اور اس کے سیاہ شیشوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مکمل اصرار کیا کہ فکر نہ کرو جب سخت دھوپ ہوگی تو یہ منظر حسین دکھائے گی۔

آپ دور دیکھنا چاہتے ہیں اور آپ کو عینک میں ایسے شیشے فٹ کر کے تھما دیا گیا ہے جس میں قریب کی چیزوں کو صاف اور بڑا دیکھنا تو ممکن ہے دور کے لیے کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

آپ کو قریب سے صاف دیکھنا ہے مگر تحفے میں دور دیکھنے کی عینک دی گئی ہے اور آپ اس مقدس تحفے کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتے۔

ارے یہ کیا دنیا تو ساری پیلی ہے!

نہیں نہیں ساری دنیا نیلی ہے!

سبز ہے سبز ہے!

سرخ ہے سرخ ہے!۔۔۔

ارے جس رنگ کے شیشے آنکھوں پر لگاؤ گے۔ دنیا اسی رنگ کی دکھے گی نا۔۔۔

مگر یہ کیا؟

آپ کی نظر کمزور ہے لیکن اس کے لیے ذاتی عینک نہیں خریدنا چاہتے!!!

آپ کا منصوبہ ہے کہ

گھر میں والدین کی عینک،

مدرسہ میں اساتذہ کی عینک،

یار دوستوں میں انہی کے چشمے،

بچوں بچو نگڑوں میں ان کی رنگ برنگی موٹے پتلے شیشوں والے مختلف گاگلز سجا کر بہترین گزارا ہو جائے گا۔۔۔

وقت کٹ جائے گا۔۔۔

کلام الٰہی کی زبان عربی

اور

مجھے عربی نہیں آتی۔۔۔ کبھی کسی عالم کا ترجمہ قرآن، کبھی کسی عالم کا ترجمہ قرآن۔۔۔ میری ضرورت ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ جس نے ترجمہ کیا۔۔۔

اس کی علمیت،

زباندانی کی مہارت،

ماحول کی ضروریات،

تبلیغ کا شوق یا عدم شوق،

مزاج کی شدت یا سہل پسندی۔۔۔ وغیرہ وغیرہ اس کے ترجمے میں شامل ہو چکی ہے۔۔۔۔ مختلف عینکوں کی طرح اس میں بھی کوئی ایک وصف یعنی دور یا پاس دیکھنے، چھاؤں یا رنگ دیکھنے کی صلاحیت ہے۔۔۔۔ وقتی طور پر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔۔۔۔

کیونکہ آپ مختلف ہیں۔

مسئلہ کلام الٰہی میں نہیں۔ مسئلہ ایسی اپروچ کا ہے جس میں محتاجی ہے۔ ایسی صورت میں کلام الٰہی کا ترجمہ آپ کی زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے۔

کسی اور کی نظر سے، کسی اور کے ذہن سے پڑھیے اور سمجھیے اور سر دھنیے۔ شخصیت پرستی اور فرقہ پرستی کی راہیں ہموار کیجیے۔ اس میں اس ترجمہ کرنے والے کا قصور نہیں۔ قصور محتاج اور اپاہج کا ہے۔

اپنی نظر سے دیکھیے اپنے فہم سے جانیے سوچیے سمجھیے۔ کلام الٰہی کی زبان عربی سیکھیے اس سے محبت کیجیے۔ اس سے بلاواسطہ، قریب کی دوستی کر لیجیے۔ اسے اپنی آنکھ سے دیکھیے اپنے فہم سے سمجھیے۔ محتاجوں تک پہنچائیے۔۔۔

جسے قبر میں، پل صراط پر، روز محشر، جنت میں رفیق اور دل کی بہار بنانا چاہتے ہیں آپ کے اور اس کے درمیان بہت سے واسطے آ گئے ہیں۔۔۔ حجاب بڑھ گئے ہیں۔۔۔ ان کو دور کرنے کی تیاری کے لیے وقت ہے آپ کے پاس؟؟؟

ہے تو مبارک ہو

(خیر کم من تعلم القرآن وعلمہ) خوشخبری آپ کے لیے

وقت نہیں ہے تو جتنے لمبے واسطے ہیں اتنی دوری سے کرم کے منتظر رہیے۔۔۔ اللہ کریم ہے۔ رحیم ہے۔ معاف فرمانے والا ہے۔ بس آپ کے پاس اپنی سستی کی حجت کوئی نہیں۔ دلیل کوئی نہیں۔۔۔

بتائیے ہے آپ کے پاس؟

☆☆☆☆☆

وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی

ایک جگہ وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی سے یہ استدلال نظر سے گزرا کا آپ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ وحی ہوتا تھا۔ کیا اس آیت کا تعلق آپ کی گفتگو سے ھے۔ اگر ایسا ھے تو میرا اشکال یہ ھے کہ

1_ جو شخصیت اپنے اختیار اور ارادے سے کوئی بات نہیں کرتی اور کر سکتی وہ میرے لئے کیسے نمونہ ہو سکتی ھے کیونکہ میری کیمسٹری ہی مختلف ھے۔ وہ نعوذ باللہ Remote Controlled اور میں Self-Controlled دونوں میں کوئی نقطہ اشتراک ہی نہیں۔ میرے لئے میری طرح کا ارادہ اختیار اور خواہشات رکھنے والا ہی نمونہ ہو سکتا ھے۔

2_ اگر یہ بات درست ھے کہ آپ کی ہر بات وحی کی پیشگی ہدایت پر ہوتی تھی تو آپ کے کئی ایک فیصلوں کو قرآن نے Approve کیوں نہیں کیا۔ کیا اللہ ایک فیصلہ کرواکے پھر کہتا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ بیویوں کو خوش کرنے کے لئے؟ یعنی جو اجتہادات نبوی اللہ نے Approve نہیں کئے وہ بھی وحی تھے؟

اگر آیت کا تعلق آپ کی روزمرہ گفتگو سے نہیں ھے تو آیت کا کیا مطلب ھے اور آپ کے ارشادات کی کیا حیثیت ھے۔؟

میری رائے میں آیت کا تعلق ارشادات نبوی سے نہیں بلکہ قرآن سے ھے کیونک مکہ والوں کے سامنے آپ کا دعوی یہ نہیں تھا کہ میری زبان سے جبریل بولتے ھیں بلکہ سارا جھگڑا قرآن کے وحی ہونے یاخود ساختہ ہونے کا تھا۔اور اسی کے بارے میں کہا گیا کہ یہ وحی ھے۔رہی یہ بات کہ نطق کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا تو اس کی وجہ یہ ھے قرآن لوگوں کے سامنے نطق اور گفتگو کے طور پر پیش کیا جاتا تھا کتاب کی صورت میں نہیں تاہم قرآن نے کتابی بیان کے لئے بھی نطق کا لفظ استعمال کیا ھے ھذا کتابنا ینطق علیکم بالحق۔

رہی یہ بات کہ آپ کی ذاتی گفتگو کی کیا حیثیت تھی تو قرآن نے اسے دو طرح تحفظ دیا۔

1_ قرآن میں ھے واصبر لحکم ربک فانک باعیننا آپ ہماری نگاہوں کے سامنے ھیں یعنی آپ کی ہر بات پر ہماری نگاہ ھے اور ہماری خامشی (تقریر) کو Approval سمجھا جائے۔اور اگر کہیں کوئ بات مناسب نہ ہوئ تو بتادی جائے گی

2_ آپ کے بعض اجتہادات کو تبدیل کروانا اس بات کی دلیل ھے کہ آپ کی نجی سرکاری اور ہمہ پہلو زندگی کے تمام معاملات کو اگر کسی بات کی تصحیح نہیں کروائ گئ تو الٰہی پذیرائی حاصل تھی۔

☆☆☆☆☆

علیؑ مولا کا تصور مقصدِ دین وزندگی کی نظر سے

ہجرتِ حبشہ کرنے والے اصحابؓ نے جب حبشہ کے عیسائی بادشاہ محترم نجاشی کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق قرآنی عقیدہ بیان کیا تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکہ اُٹھایا اور بولے عیسیٰؑ سے متعلق قُرآن جو بیان کرتا ہے اُنکی فضیلت میں اس تنکے جتنا اضافہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ محترم نجاشی کی بات کو ہی آگے بڑھاتے ہُوئے میں بہت سادگی سے کہنا چاہتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سمیت صحابہؓ اور اہلِ بیتؑ کا جو مرتبہ اور دین میں انکی جو اہمیت قرآن نے بیان کر دی ہے اُسمیں ایک تِنکے جتنی بھی مبالغہ آرائی بندے کے اللہ سے تعلُق پر ضرور ضرب لگائے گی۔

یاد رکھ لیجیے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی کامِل بندگی کر دکھانے والے وہ عاجزِ انسان ہیں جنھیں اللہ کا آخری، حتمی اور مکمل پیغام انسانوں تک پہنچانے کا شرف دیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئیس سال میں اُس پیغام کی عملی اور کامل تشریح بھی کر دکھائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر الہامی پیغام و وحی کا سلسلہ تمام ہوا. اللہ کا تعارُف، بندوں سے اُسکے مطالبات اور بندوں کے اُس سے مسلسل رابطے کی عملی تشریح کر کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی موت کا وہ ذائقہ چکھنا پڑا جو بقولِ قُرآن ہر نفس کو چکھنا ہے، آپ صلی کا لایا ہوا پیغامِ الٰہی جِس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فضیلت اور نا قابلِ مثال شان سے نوازا البتہ موجود ہی، جسکا یہ قُرآن پیغام ہے وہ بھی نہ صرف زندہ ہے بلکہ ہر لمحہ اس انتظار میں رہتا ہے کہ اُسکے بندے اُسے پکاریں، بقولِ قرآن وہ ہر پکار کا جواب دیتا ہے، محمد صلی اللہ علیہ نے پیغامِ الٰہی اور خالق کے اس مطالبے کی جو عملی تشریح کر دکھائی تھی وہ بھی رائج سُنّت کی شکل میں زندہ ہے۔

اس پیغامِ الٰہی کی عملی تشریح کی بتدریج اور پُر حکمت تشریح کے دوران لاکھوں اصحابؓ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا، اللہ اُنسے راضی ہوا، ان اصحابؓ میں محمد صلی کے بعض قریبی عزیز اور اہلِ خانہؓ بھی شامل ہیں اور ایسے بھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معاونت اور مدد میں سبقت لے گئے، انہیں اللہ نے سابقون کہہ کر باقی اصحابؓ پر فضیلت دی۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہؓ اور خاندان کے بعض افرادؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے الہامی مشن کی پیروی میں اپنا تن من دھن سب وارتے ہوئے اپنی زندگیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین پر صرف کر دیں۔ ان افراد کی تعداد بھی لاکھوں میں ہے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ان سبھی جان نثاروں کا صلہ اللہ کے پاس محفوظ ہے، ان افراد کی زندگیوں کے قصے قیامت تک کے مسلمانوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کامِل پیروی کی مثال سمجھاتے رہیں گے۔ انکی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور مِشن کے لیے قُربانیاں ایسی ہیں کہ انھی کے انداز میں انکی پیروی قیامت تک کے ہر مومن کے لیے فلاح کا بلیو پرنٹ ہے۔ ان میں سے ایک بھی نہ تو نبوّت میں حصے دار ہے نہ اُس پر اللہ کی جانِب سے کوئی ایسا پیغام یا وحی نازل ہوئی جسے ماننا مسلمانوں پر فرض ہو۔ ان سب مسلمانوں سے اللہ کے دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جو جنرل مطالبہ تھا، قیامت

تک کے ہر مسلمان سے عین وہی مطالبہ رہے گا، یہ لوگ تو وہ مطالبہ کامل انداز میں پورا کر کے انعام یافتہ اور رضی اللہ کہلائے، ہمارا ٹیسٹ ہماری موت تک جاری ہے۔ یہ ٹیسٹ اللہ کی اطاعت کا امتحان ہے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی لائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے جو بھی فرض کیا اُسکی روح بس ایک ہی شخصیت کے گرد گھومتی ہے، اللہ، اللہ، اللہ اور اللہ ہی کے ارد گرد۔

مُحمد صلی اللہ علیہ وسلم مُحمد ہُوئے اللہ کے تعارف اور مکمل مطالبے کی کامِل ترسیل کی ذمہ داری کے باعث۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم افضلُ البشر ہوئے اس مطالبے کی کامِل تکمیل کے باعث۔

صحابہؓ میں سے بعض اور اہلِ بیتؓ میں سے بعض سابقون ہوئے اللہ کے مطالبے پر پُر جوش اور مسلسل لبیک کے باعث۔

یعنی لے دے کر جو ذات مومن کے خیالات کی محور ہونی چاہیے وہ بس اللہ ہی ذات ہے۔ وہ اللہ جو ہر لمحہ آپ کے ساتھ ہے، انبیاؑ، اُنکے ساتھیوںؓ، اُنکے مددگار اور مُقدس اہلِ خانہ کی موت کے بعد بھی جو ہمارے ساتھ ہے اور اپنی موت کے بعد ہم جس کے قبضے میں جائیں گے وہ اللہ ہے،

اللہ جو بس ایک پُکار کی دوری پر ہے، اللہ جو ایک خیال کی دوری پر ہے،

وہ شخصیت جو ہماری روح، ہمارے جسم اور ہماری شخصیت یعنی نفس کے جنکشن پر ہمارے اندر باہر ارد گرد ہر جگہ موجود ہر لمحہ محبت سے ہمیں دیکھتی ہے وہ اللہ ہی ہے جسکے تعارُف اور جسکے مکمل مطالبے کی کامل تشریح کے لیے انسانوں میں سے ایک کامل انسان محمد صلی اللہ کو چُنا گیا۔

یہ تمہید اس لیے ضروری تھی کہ آپ کو یہ سمجھ آجائے کہ انبیاؑ کیوں بھیجے جاتے رہے۔

اب اُس زبان زدِ عام روایت کی طرف آتے ہیں جسے بیشتر محدثین سرے سے ہی مشکوک بتاتے ہیں۔ ہم البتہ دین اور زندگی کے مقصد پر بات کرتے ہوئے فرض کر لیتے ہیں کہ یہ روایت مشکوک نہیں بلکہ صحیح ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے محترم علی رضی اللہ عنہ اور بعض صحابہؓ کے مابین موجود کسی مسئلے کو سُلجھانے کے لیے علیؓ کا قریب ترین عزیز کے ناطے واقعی یہ فرمادیا ہو گا کہ جِس کا علیؓ مولا اُس کا میں مولا،

یعنی جس کا علی دوست اور مددگار اُس کا میں بھی دوست اور مددگار۔

اب اس روایت کو صحیح فرض کر کے بھی اوپر بیان کی گئی تمہید کے تناظر میں نہ تو اسے معاملے کے پسمنظر سے الگ کر کے قیامت تک کے اُن مسلمانوں سے جوڑا جا سکتا ہے جنہوں نے نہ علی رضی اللہ عنہہ کو دیکھا نہ اُن کا زمانہ پایا، نہ ہی اس فرمان کے جنرلائز اصول نہ بننے سے دین کے ہم سے مطالبے یا اسکے مقصد پر کوئی فرق پڑتا ہے، اور نہ ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نبوّت یا الہامی ہدایت کے تسلسل کا عشرِ عشیر بھی محمد صلی علیہ علیہ وسلم کے بعد علی رضی اللہ عنہہ کو ملا تھا۔

اگر مگر لیکن چونکہ چناچہ جیسے الفاظ ساتھ لگا کر ہی سہی کائنات کا ہر مسلمان اس بات کو بھی مانے گا کہ نبوّت اپنے ہر معنی اور ہر تشریح میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکی اور اس حقیقت کو بھی کہ قیامت تک کے مسلمانوں پر صرف قُرآن اور وہ فرض ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کر دکھانے کے بعد عمومی لازم قرار دیا۔

یعنی اگر مگر جیسے الفاظ کے ساتھ ہی سہی، ہر مسلمان یہ تو ماننے پر مجبور ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دین میں نہ تو کوئی نیا لفظ مسلمانوں کے عمومی فرائض میں شامل ہو سکتا ہے نہ شخصیت نہ نظریہ نہ عقیدہ نہ عبادت اور نہ ہی مقام،

لیکن کیا کیجیے کہ بُت پرستی اور انسان کا اسکی تخلیق کے کچھ عرصہ بعد سے ہی تعلق بن گیا تھا،

بیشتر انبیاؑ کی وفات کے بعد الہامی مذاہب ماننے والی تقریباً تمام ہی اقوام اگر مگر کے ساتھ بُت پرستی کی طرف راغب ہونے کی تاریخ رکھتی ہیں،

مسلمانوں کے ہاں بھی اس انسانی روِش کو کچھ تو رواج ملنا ہی تھا کیونکہ یہ ماننا آسان بھی کہاں تھا کہ نبیوںؑ کا وہ سلسلہ ختم ہو گیا جسکے ذریعے لوگ اللہ سے جُڑے رہتے تھے۔

الہامی اور ہر ایک پر فرض نبیوں جیسے انسان مولا کا تصور گھڑ لیے جانا اُسی انسانی جبلّت کا شاخسانہ ہے۔

اس بات سے بھی قطع نظر کہ ہم علی رضی اللہ عنہہ کے دور میں ہی ہیں یا اُنکی شہادت کے چودہ سو سال بعد کے دور میں، اہم سوال یہ ہے کہ کیا میرے لیے دین کا مطالبہ کُچھ اور ہے اور علی رضی اللہ عنہہ کے لیے کُچھ اور؟

ہر گِز نہیں، مجھ پر اور آپ پر بھی وہی دین فرض ہے جو علی رضی اللہ عنہہ سمیت تمام اہلِ بیتؓ اور صحابہؓ پر فرض تھا۔

مجھے بتایئے دین کا وہ کونسا حکم ہے جسکی پیروی اپنے دور میں علی رضی اللہ عنہہ پر تو لازم تھی ہمارے دور میں مجھ پر یا آپ پر نہیں؟

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ دین کا ایسا ایک بھی جُز موجود نہیں۔

گو کہ ابتدائی پیراگرافس میں اس بات پر بحث کی گئی ہے لیکن پھر بھی اپنی عقل سے ذرا سا سوچ کر اگر مگر لیکن چُونکہ چُنانچہ کے بغیر سادہ سے الفاظ میں یہ بتایئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بطور آخری نبی اور آخری رسول اس دنیا کی طرف کِس مقصد کے لیے بھیجے گئے تھے؟

کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے یا اپنی فیملی کے تعارُف لیے بھیجے گئے تھے یا اللہ کے تعارُف اور مطالبات کو دنیا کے سامنے رکھنے کے لیے؟

آپ بخوبی جانتے ہیں کہ انبیاؑ اور رُسلؑ اللہ کے عاجز اور کامل بندے ہیں، ان سب میں سے ہر ایک کو فقط اللہ کی صفات کے تعارُف اور اُسی کے مطالبے کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا یہاں تک کہ انسانی شعور ارتقادر ارتقاسے گزرتا ہوا ایک ایسی سٹیج تک پہنچا کہ ہزاروں لاکھوں سال سے نازل ہوتا دین مکمل کر دیا جائے۔

وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے جنہیں یہ اعزاز ملا کہ اُن پر دین کی تکمیل ہوئی۔ جب تک نبوّت جاری تھی بعض انبیاؑ اپنی زندگی میں ہی اگلے نبیؑ کی نشاندہی اور تصدیق بھی کرتے رہے لیکن نبوّت اپنے ہر مفہوم اور ہر تشریح میں ختم ہو جانے کے بعد ایسا ممکن ہی نہیں تھا کہ آخری نبی اور رسُول محمد صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے مسلمانوں پر کسی انسان کی مخصوص الہامی حیثیت ماننا فرض یا واجِب کر دیتے، ہاں اُس وقت موجود مسلمانوں کو سیاسی اور سماجی لیڈر شِپ کی ضرورت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی رہنی تھی تبھی سخت علیل ہونے پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز کی امامت کے لیے ابُو بکر رضی اللہ عنہہ کو آگے کر دیا۔

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس علامتی حکم کا یہ مطلب بہر حال نہیں تھا کہ ابُو بکر رضی اللہ عنہہ اب قیامت تک کے مسلمانوں کے امام اور ولی ہونگے، اسی حقیقے کا عملی اظہار کرتے ہوئے اپنی موت سے پہلے ابُو بکر رضی اللہ عنہہ نے عُمر رضی اللہ کو اگلی نسل کے لیے بطور سماجی لیڈر اور امام آگے کر دیا اور یوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ علی رضی اللہ عنہہ پر اپنے دور کے مسلمانوں کی لیڈر شپ کی ذمہ داری آن پڑی۔ یہ سلسلہ

بعض مسائل کے ساتھ مزید آگے بھی بڑھتا رہا، ہمارا مقصد اس سلسلے پر بات کی بجائے نبوّت کے خاتمے کے بعد ہر دور میں مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے لیڈر شپ کی موجودگی کا اصول سمجھنا تھا۔

مسلسل آگے بڑھتا یہ سلسلہ بس اس حقیقت کا غماز تھا کہ ہر دور کے مسلمانوں کو ایک ایسے لیڈر اور امام کی ضرورت تو رہے گی جو اُنکے بیچ رہ کر سماجی، روحانی، دفاعی، معاشی اور انفرادی معاملات میں قرآن و سُنّت اور اپنے علم و عقل کے ذریعے اُنکی رہنمائی کرتا رہے۔

یہ نکتہ سمجھنے کا ہے کہ ابُو بکر صدیقؓ، عُمرؓ، عُثمانؓ اور علیؓ وغیرہ جیسے اصحابِ رسُولؐ نے اپنے اپنے ادوار میں اپنی اپنی رُعیت کو وہ لیڈر شپ تو فراہم کی جو اہلِ علم، اہلِ عقل اور صاحبُ الرائے افراد سے ہر دور میں دین کا تقاضہ رہے گا لیکن ان میں سے ایک بھی شخص ایسا نہیں جس پر اُسکی وفات کے بعد پیدا ہونے والے افراد کی بھی ذمہ داری ہو حالانکہ یہ سب افراد اپنے اپنے دور کے افراد کے سماجی مسائل میں ولی بھی تھے مولا اور مددگار بھی۔

اگر آپ اصول سمجھے ہیں تو میرا مولا یعنی مددگار بننے کے لیے ان افراد کا میرے حالات اور وسائل و مسائل سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے، انکے پاس اُس برزخ کے پردے سے پار سے جہاں یہ موت کے بعد موجود ہیں ہر دور کے افراد سے تکلم اور رابطے کی طاقت ہونا بھی ضروری ہے، اگر انہیں یہ طاقت ہے تو یہ اللہ کے شریک ٹھہرے جبکہ جو دین قرآن سمجھاتا ہے اُسکے مطابق اللہ کی صفات میں کوئی شریک ہو ہی نہیں سکتا۔ وفات پا چکے افراد کو مولا ماننے کا معاملہ صرف اللہ کی صفات میں شِرک کا نہیں ختمِ نبوّت اور تکمیلِ دین جیسے مفاہیم بھی اسکی زد میں آئیں گے۔ گویا ضروری ہے کہ پھر نبوّت کی ایک نئی قسم کا جاری ہونا بھی ماننا ہو گا۔ جو مجھے سُن نہیں سکتا، میری روح پر میری اُلجھنیں سُلجھانے کی ترکیب نازل نہیں کر سکتا وہ میرا مولا نہیں ہو سکتا۔۔ جاری ہے۔۔ **محمد رضوان خالد چوھدری**

☆☆☆☆☆

جہانِ امثلہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے منافقین کی ریشہ دوانیوں کو قیامت تک کہ ہر قاری قرآن کے سامنے نشان عبرت بیان کرنے کے لیے "مثال" کا اسلوب اپنایا۔

"مثال" سے کیا ہوتا ہے؟

مثال در حقیقت "تخیل" کو مہمیز کرنے، اسے آزادانہ مگر ایک خاص دائرہ میں پرواز کرنے کی تربیت کا نام ہے۔

مثال ایک ہوتی ہے مگر ہر صاحب عقل و دانش اس سے مختلف معارف اور نتائج نکالتے چلے جاتے ہیں۔

"مثال" میں تعبیرات کا تنوع اور اختلاف دراصل مقصود بھی ہوتا ہے تاکہ معانی میں مناسبت نظر آئے اور وسعت پیدا ہوتی جائے۔

یوں مختلف علمی، معاشی، معاشرتی، لسانی، تہذیبی۔۔۔پس منظر کے حاملین کے لیے، اس مثال کو سمجھنے اور حالات حاضرہ کے ساتھ اس کی مناسبت جاننے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔

پکچر ڈسکرپشن

PICTURE DESCRIPTION

اسلام آباد ماڈل کالجز کے جونیئر سیکشنز میں طلباء و طالبات کو اردو اور انگریزی کے مضامین میں ایک سرگرمی تصویری وضاحت یا پکچر ڈسکرپشن کی کرائی جاتی ہے۔ قوت مشاہدہ، قوت متخیلہ، اور مخصوص زبانوں میں قوت بیان کی صلاحیتیں اس سے خوب متحرک ہوتی ہیں۔ ہر طالب علم اپنی صلاحیتوں کے مطابق اس تصویر کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے اور بہت کچھ سیکھتا ہے۔

اللہ تعالی نے منافقین کے حوالے سے جو مثالیں بیان کیں ان پر غور کیا جائے تو انہیں پڑھتے ہی قوت متخیلہ ہمیں اپنی یادداشت کی مناسبت سے کچھ تصویریں دکھانے لگتی ہے اور مثال غائب ہونے کے باوجود سامنے نظر آنے لگتی ہے۔

منافقین کی دوسری مثال ایک برستے بادل کی سی ہے جس میں بیک وقت اندھیرے در اندھیرے ہیں۔ کڑک کی گونج اور دھمک سن کر جان کے لالے پڑ جاتے ہیں اور بجلی کی چمک اتنی اچانک اور اس قدر تیز کہ جس پر پڑ جائے بھسم کر ڈالے اور اس کی چمک سے بصارت تک مفقود ہو جائے۔ یہ سب منافقین کے لیے ہیبت ناک ہے

انہیں اپنی زندگی کے لالے پڑ گئے ہیں۔ اسی خوف میں ان کی عقلیں سوجھ بوجھ کھو بیٹھی ہیں چنانچہ کانوں میں ایک ایک انگلی کی جگہ ساری ساری انگلیاں ٹھونس کر بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

اب پکچر ڈسکرپشن جو قاری نے کرنی ہے وہ قرآن حدیث وسیرت کے دائرے کی متقاضی ہے۔ تاکہ پتا چل سکے پانی سے بھرے برستے بادل سے کا کیانام ہے؟

اس میں موجود اندھیرے کیا ہیں؟

یہ کڑک کون ہے؟

اور بجلی کیاہے؟ اس کی چمک کیاہے؟

کیا آپ بتاسکتے ہیں؟؟؟

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

☆☆☆☆☆

کبھی سوال کے حسن کو پرکھا ہے آپ نے؟

"سوال" ایک عظیم سرگرمی ہے۔

"سوال" اپنے اندر معانی فہم اور وسعت کا ایک بیکراں جہاں لیے ہوتا ہے۔ یہ متکلم کی ذہنی صلاحیتوں اور علمی مہارتوں کے راز فاش کر دیتا ہے۔

کبھی کبھی سوال کرنے والا کچھ جاننے کے لیے نہیں بلکہ بتانے اور سکھانے کے لیے سوال کرتا ہے۔

درست جگہ سوال کرنے سے مشکل آسانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا جب حضرت جبریل علیہ السلام شدید سفید لباس پہنے انسانی شکل میں نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک شاگرد کی طرح گھٹنے ٹیک کر آبیٹھے اور اپنے سوالات سے ایمان، اسلام اور احسان کی تعلیمات سکھلائیں۔

پہلا سوال یہ تھا:

يا رَسولَ اللَّهِ ما الإيمَانُ؟

اے اللہ کے رسول "ایمان" کیا ہے؟

قالَ: الإيمَانُ أنْ تُؤْمِنَ باللَّهِ ومَلَائِكَتِهِ، وكُتُبِهِ، ورُسُلِهِ، ولِقَائِهِ، وتُؤْمِنَ بالبَعْثِ الآخِرِ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ایمان اللہ تعالی اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن اس سے ملاقات کرنے اور موت کے بعد جی اٹھنے پر یقین رکھنے کو کہتے ہیں۔

قالَ: يا رَسولَ اللَّهِ ما الإسْلَامُ؟

پھر حضرت جبرئیل نے اسلام کی حقیقت پوچھی۔

قالَ: الإسْلَامُ أنْ تَعْبُدَ اللَّهَ ولَا تُشْرِكَ به شيئًا، وتُقِيمَ الصَّلَاةَ، وتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ المَفْرُوضَةَ، وتَصُومَ رَمَضَانَ،

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائو، اور نماز قائم کرو، زکوۃ کے فریضہ کی ادائیگی کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔

قالَ: يا رَسولَ اللَّهِ ما الإحْسَانُ؟

اب تیسرا سوال احسان کے بارے میں کیا۔ احسان کیا ہے؟

قالَ: الإحْسَانُ أنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأنَّكَ تَرَاهُ، فإنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فإنَّه يَرَاكَ،

تو آپ نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو کہ جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو گر تم اسے نہیں دیکھتے تو پھر بھی وہ تمہیں ضرور دیکھتا ہے۔

قالَ: يا رَسولَ اللَّهِ مَتَى السَّاعَةُ؟

پھر حضرت جبرئیل نے قیامت کے واقع ہونے کے وقت کا پوچھا۔

قالَ: ما المَسْئُولُ عَنْهَا بأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ

فرمایا کہ مسئول کو سائل سے زیادہ علم نہیں۔

ولَكِنْ سَأُحَدِّثُكَ عن أشْرَاطِهَا: إذَا ولَدَتِ المَرْأَةُ رَبَّتَهَا، فَذَاكَ مِن أشْرَاطِهَا، وإذَا كَانَ الحُفَاةُ العُرَاةُ رُؤُوسَ النَّاسِ، فَذَاكَ مِن أشْرَاطِهَا،

تاہم میں تمہیں قیامت کی نشانیاں بتاوں گا۔ تم لونڈی کو دیکھو گے اپنے آقا کو جنم دیتے ہوئے۔ اور تم ننگے پیروں اور ننگے بدنوں والوں کو لوگوں کے سردار بنے دیکھو گے۔ یہ قیامت کی نشانیاں ہیں۔

في خَمْسٍ لا يَعْلَمُهُنَّ إلَّا اللَّهُ: (إنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ويُنْزِلُ الغَيْثَ ويَعْلَمُ ما في الأرْحَامِ)

پانچ چیزوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ قیامت کا وقت، بارش اور جو رحموں میں ہے۔

ثُمَّ انْصَرَفَ الرَّجُلُ، فَقالَ: رُدُّوا عَلَيَّ فأخَذُوا لِيَرُدُّوا فَلَمْ يَرَوْا شيئًا،

پھر وہ شخص چلا گیا تو آپ نے اسے واپس لانے کو کہا کچھ لوگ اسے لوٹانے کے لیے نکلے مگر وہ جا چکا تھا۔

فَقالَ: هذا جِبْرِيلُ جَاءَ لِيُعَلِّمَ النَّاسَ دِينَهُمْ.

تب آپ نے بتایا کہ یہ جبرئیل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔

(أبو هريرة: صحيح البخاري)

ایمان اسلام اور احسان کی حقیقت سکھانے کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تشریف لائے۔

تینوں پر تدبر و تفکر کیجیے تو ایمان باللہ نماز اور تقاضہ عبودیت یعنی حضوری کے تصور میں زبردست ربط آپ کے خیال کو جکڑ لیتا ہے اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔

أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فإنّه يَرَاكَ

اس جملے کو سمجھنا اور ماننا کوئی معمولی بات نہیں۔

اس میں ہدایت صراحتاً موجود ہے کہ آپ اسے پڑھ کر بظاہر سمجھیں گے کہ ایسا شخص جو اللہ کی یاد میں اس قدر ڈوب جائے کہ دنیاومافیہا سے بے خبر ہو جائے تو وہ اپنے رب کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

نہیں بالکل ایسا مفہوم مراد لینا درست نہیں اس لیے کہ عبادت کی اولین شرائط عقل اور بلوغ ہیں دیوانگی مجنونیت نہیں۔ ہوش مند انسان عبادت کا مکلف ہے نہ کہ عقل و خرد سے بیگانہ۔ دوران عبادت اللہ کو دیکھنا مطلب اس کی بنائی ہوئی دنیا اور اس میں موجود مخلوقات کا خیال رکھنا اور حسن سلوک کرنا معاملات میں اللہ کے احکام پر پورا عمل کرنا حقوق العباد پورے کرنا" اللہ تعالی کو دیکھنا ہے"۔ اگر انسان اللہ کو دیکھنے کا تصور نہیں کرتا اور کوتاہی کرتا ہے تو اللہ تو انسان کی ہر اچھائی و برائی سے مکمل واقف ہے۔

متقین کی اقامتِ نماز روزمرہ کے ہر کام میں اللہ تعالی کی خوشنودی کی فکر اور پرواہ کرتے ہوئے درست اعمال بجا لانا ہے۔

☆☆☆☆☆

ہو امال انسانیت کے کام آئے گا۔ مجھے آپ سب کا تحفظ مقصود ہے۔ انسانیت کا احترام مقصود ہے۔ شہرت اور پیسہ مقصود نہیں۔ انسانیت کی خدمت سے بڑی کوئی عبادت نہیں۔

جناب آپ کے علاقے میں ترقیاتی کام بالکل بھی نہیں ہورہے۔ تعلیم اور طب کی سہولیات نہیں ہیں۔ پینے کو صاف پانی نہیں ہے۔ نوکریاں نہیں ہیں۔۔۔۔۔ اگر آپ مجھے ووٹ دیں گے تو میں اور میری سیاسی پارٹی آپ کی سہولیات کے لیے دن رات ایک کر دیں گے۔ ہمیں صرف اور صرف آپ کی خوشیاں آپ کی ترقیاں عزیز ہیں۔ اسی کے لیے ہم اپنا مال اور خون تک بہانے کو تیار رہتے ہیں۔ وزارتوں سے ہمارا تعلق فقط اسی کے لیے ہے۔ یہی ہماری عبادت ہے۔

عورت کی تعلیم ایک فرد کی نہیں بلکہ پورے خاندان کی تعلیم ہوتی ہے۔ تعلیم عورت کو اپنے حق کی پہچان کراتی ہے۔ اسے اپنی ذات پر اعتماد بخشتی ہے۔ وہ باندی نہیں جو پہلے اپنے باپ بھائیوں کے لیے خود کو چولہے میں جھونکے پھر بیاہ کر شوہر کی خدمت کرتی رہے۔ اس کے بچے پیدا کرے اور انہیں پالنے میں اپنی خوبصورتی اور تعلیم کو بھول جائے۔ اپنے آپ کو بھلا دے۔ کیا معاشرے کو اس کی خدمات کی ضرورت نہیں؟۔ سچ یہ ہے کہ عورت کی اہمیت مرد سے بھی زیادہ ہے وہ اس کائنات کی رونق اور خوبصورتی ہے۔ اسے اپنی ذات اور خوبصورتی کے اظہار کا حق ملنا چاہیے۔ عورتوں کے حقوق کے لیے ہم نے بلا رنگ و مذہب تنظیمیں بنا رکھی ہیں۔ آپ بھی اس میں شامل ہو جائیں۔ ہمیں آپ سے کوئی ذاتی مفاد درکار نہیں۔

ہمارا کام تفریح فراہم کرنا ہے۔ غربت اور فرسٹیشن کی ماری مخلوق چند لمحیں ٹی وی سکرین پر محلوں جیسے گھر اور ٹھاٹ باٹھ کی زندگی دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ چند رومان پرور مناظر ان کے اندر زندگی کی رمق دوڑا دیتے ہیں۔ زندگی کے تلخ حقائق دکھا کر ہم لوگوں کو مزید آرزدہ نہیں دیکھ سکتے۔ دیکھیے یہ جو گھر گھر میں ہو رہا ہے ہم وہ بھی دکھاتے ہیں۔ ساسوں کا ظلم، مردوں کا ٹھرکی پن، خواتین کا بیاہ کے بعد بھی تین تین عاشقوں سے ملاقات کا منتظر ہونا۔ شوہروں کا اپنی بیویوں پر کڑی نظر رکھنا اور خود کسی مجبور لاچار لڑکی کو سہارا دینا اور فقط

شریعت کی خاطر نکاح کرنا وغیرہ وغیرہ۔ہم یہ سب آپ کی خدمت کے لیے کرتے ہیں؟ہم تو آپ کی آواز آپ کے خادم ہیں۔یہی ہماری عبادت ہے۔

آپ کون کون سی خدمات بلا معاوضہ انجام دے رہے ہیں۔

☆☆☆☆☆

فطرت بمقابلہ صناعت

بیٹا آپ کو کون سا پھل پسند ہے؟ کیا لے کر دوں؟

نہیں نہیں میں نے کچھ نہیں کھانا مجھے بھوک نہیں۔

اچھا چاکلیٹ دلاوں؟

جی ہاں! یہ ٹھیک ہے اور ایک Pepsi کا کین بھی لیتی آیئے گا۔

آج کل بچے، بچیاں، لڑکے لڑکیاں قدرتی طور پر موجود پھلوں کی صورت میں غذا سے انکاری ہوتے ہیں لیکن اگر انہیں کسی مصنوعی خوراک کے بارے میں پوچھا جائے تو فورا تیار۔برگر، شوارما، پزا

دودھ پینے سے انکاری، شہد کی مٹھاس انہیں بے کار لگتی ہے ہاں Nutella کو بریڈ کے توس پر لگا کر کھانا اچھا لگتا ہے۔پانی نیسلے کا ہونا چاہیے۔

نوجوانوں کو دیکھیے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کو کیسا ساتھ پسند ہے؟

رومانس اور تھرل سے بھرپور جس میں کوئی پردہ داری نہ ہو۔جس میں کوئی ذمہ داری بھی نہ ہو۔پاکیزگی؟ مطلب وہی پینڈو اور بیکورڈ مشرقیت نامنظور۔ایسا تنگ نظر ساتھ سوہان روح ہے۔

سوچیے! آج کل کے بچے بچیاں ایسی جگہ کو پسند کس حد تک پسند کریں گے جہاں ماحول فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ طرح طرح کے تازہ پھل ہوں لیکن کھانے والے قدرتی حالت میں کھانا قبول نہ کریں۔

جہاں ماحول میں شرم وحیا اور طہارت وصف خاص ہو۔وہاں گزارا کیسے ممکن ہے؟؟

کچھ آپ بھی بتایئے۔

☆☆☆☆☆

ذکر رسول مقبول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (سورۃ البقرۃ کی روشنی میں)

1۔ کیا محبت ہے! جب قرآن مجید کا تذکرہ کیا تو "انزل الیک" (آیت:4) اور "انزلنا الیک" (آیت:99) کہا اور جب تورات زبور انجیل صحف ابراھیم و موسی کا ذکر کیا تو اسے بھی آپ سے نسبت دے کر "من قبلک" (آیت: 4)

اور جب بعثت کا تذکرہ کیا تو اپنی طرف نسبت دے کر کہا: "ارسلنک" (آیت:119) "رسول من عند اللہ" (آیت:101) "الرسول" (آیت:285، 143)

2۔ دلوں کے حال سے تو وہ خود واقف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشقت میں پڑنا۔۔۔ کفار کے لیے دکھی ہونا ۔۔۔ اللہ تبارک و تعالی کو منظور نہ تھا تو دلجوئی یوں کی: "اانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون" (آیت:6)

3۔ بھلا اس کی صداقت امانت اخلاص اور رفعت شان کا کیا مقابلہ جس کا تعارف خالق و مالک رب العالمین کرائے تو کہے: "عبدنا"۔ (آیت:23)

4۔ محبت تعاون اور اختیار دینے کا والہانہ انداز۔ خود نہ کہا بلکہ کہا "قل"

تجھے اختیار دیا کہہ دے: اگر اللہ کے پاس صرف تمہارے لیے خاص مہمان نوازی ہے تو موت کی تمنا کرو۔ (آیت:94)

کہہ دو: جبریل کے دشمنو! اللہ کے حکم سے اس نے قرآن تمہارے دل پہ نازل کیا: "علی قلبک"۔ (آیت:97)

کہہ دو: اے یہود و نصاری اگر تم ہی جنت کے اکلوتے وارث ہو تو اپنی "برھان" لاو اگر سچوں میں سے ہو۔ (آیت:111)

کہہ دو: اے یہود و نصاری! ھدایت وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو۔ (آیت:120)

کہہ دو: شراب اور جوئے کا گناہ ان سے حاصل ہونے والے نفع سے زیادہ ہے۔ کہہ دو:اے ایمان والو!جو ضرورت سے زائد ہو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔(219)

کہہ دو:یتیموں سے حسن سلوک خیر کا کام ہے۔(آیت:220)

کہہ دو:ماہواری کے دنوں میں عورتوں سے مقاربت نہ کرو۔(آیت:222)

5۔بارگاہ الٰہی میں وہ بلند مقبولیت کہ رسول اللہ سے مخاطب ہونے سے پہلے مناسب ترین لفظون کا انتخاب لازم ہے۔سوانہیں پکاروتو"انظرنا" کہو۔(ایت:104)

ان سے لایعنی سوال اور کج بحثی ایمان سے کفر کو لوٹنا ہے۔(آیت:108)

کتب الہیہ کے قاری ہر اہل کتاب ان سے یوں متعارف تھا جیسے وہ اپنی اولاد کی پہچان رکھتا تھا۔(آیت:146)

6۔یہود و نصاری کی اتباع سے بچنے کے لیےرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے امت مسلمہ کی تربیت(آیت:145،120۔،258)

7۔وہ مقصود کائنات رسول جسے مراد ابراھیم واسماعیل علیھم السلام بنایا۔(129)

8۔ایسا محبوب جس کا چہرہ سوال میں اٹھانا بارگاہ الٰہی میں وہ مقام رکھتا ہے کہ قبلہ ہی بدل دیا جائے۔(آیت:144)

جس کے تعارف سے رب اپناذکر کرے"ربک"(آیت:147)"ربہ"(آیت:285)

9۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت سے مسلمان"امت وسط"بنائے گئے۔(آیت:143)

10۔اللہ کی طرف سے کل انسانیت کے لیے قاری معلم ومربی ومزکی(آیت:151)

11۔وہ رسول جو سب سے پہلے خود اپنی رسالت اور نازل ہونے والی کتاب پر ایمان لایا۔اللہ اس کے فرشتوں ،اس کی کتب اور رسالت پر ایمان لایا۔(آیت:285)

☆☆☆☆☆

قرآن کی حفاظت۔ شکر کی روایت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مرفوعاروایت ہے:

»لَا يَشْكُرُ اللَّهَ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ«

"جو لوگوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا۔"

شکر کا جذبہ انسانوں کے لیے "مکارم اخلاق" کی قبیل سے ہے۔ حیرانی تورب العالمین پر خالق ارض سماوات پر ہے جو "الصمد" (بے نیاز) ہونے کا اعلان کرتا ہے اور باوجود اس وصف کے "شاکر علیم" "شکور حلیم" بھی ہے.

شکر کی خوبی تعلق جوڑتی ہے اور اسے استوار رکھتی ہے۔چاہے یہ تعلق رب سے ہو یا بندے سے۔جذبہ شکر روایت کو جنم دیتا ہے۔ سلسلے جوڑتا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے اور یہ عمل ایسے شجر مبارک کی شکل اختیار کر جاتا ہے جس کی "اصل" مضبوط اور ٹہنیاں آسمانوں کی وسعتوں کو پار کرتی اوپر اٹھتی جاتی ہیں۔

قرآن مجید کے نزول، کتابت و حفاظت سے لے کر آج کی نسل انسانی تک اور بعد میں آنے والی تمام انسانیت کے لیے قیامت تک علماء و صلحاءِ امتِ مُسلمہ نے اپنے قول سے اوراپنے عمل سے شکر کی ایسی تاریخ رقم کی ہے جسے جھٹلانا نصف النہار میں سورج کے ہونے کی نفی کرنا ہے۔

کسی بھی اسلامی کتب خانے میں تشریف لے جائیے قبل از اسلام اور بعد از اسلام قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، عربی و متعلقہ علوم اور مختلف زبانوں میں ان علوم کے ترجموں پر محققین کی تصانیف کے انبار نظر آئیں گے۔ایک نظر میں وحشت سی ہو سکتی ہے اور ذرا سا غور و فکر آپ کو اللہ تعالی کا اور اس کے بندوں کا شدید شکر گزار بنا دے گا۔یہ سب محنتیں قرآن مجید، کلام الٰہی کو سمجھنے اور سمجھانے، سیکھنے اور سکھانے کی ہیں۔ان میں سے کسی سے ابا و نفرت "شکر" کے جذبے کے خاتمے کی راہ ہے۔یہاں رک کر ایک مرتبہ پھر آقائے دو جہاں سیدنا محمد رسول اللہ کے فرمان کو یاد کر لیجیے

»لَا يَشْكُرُ اللَّهَ مَنْ لَا يَشْكُرُ النَّاسَ«

اسلام میں ہر کڑی دوسری کڑی سے مضبوط جڑی ہوئی ہے۔اسی مضبوطی کے لیے اللہ رب العزت نے اپنا کلام قرآن مجید دیا۔اس کی عملی تفسیر کے لیے صاحبِ قرآن سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت میں مبعوث کیا۔۔ اسلام کی بارش ایک طرح برسی اس سے فائدہ ہر ایک نے اپنی وسعت کے مطابق

اٹھایا۔۔ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ اللہ رب العزت نے خود اٹھایا۔۔وہ "شاکر علیم" اور "شکور حلیم" ہے اور نہ سمجھنے والوں کے لیے "الصمد"۔

☆☆☆☆☆

درست فیصلہ کیا ہو؟؟

ساس صاحبہ نے گاوں سے کافی مقدار میں دال بھیجی۔ ملاقات پر دریافت کرنے لگیں جو دال تمہیں بھیجی تھی وہ کس کس میں بانٹی۔ تحیر ہوا بھیجی تو ہمارے لیے تھی دوسروں میں کس لیے تقسیم کر دیتے؟

اس کا دوست اپنے فارم سے چُن چُن کر تازہ انڈے لایا تھا۔ اتنی بڑی مقدار! لیکن۔ نہیں نہیں تقسیم کر دیئے تو کم رہ جائیں گے۔ جیسے بھی ہو خود ہی کھائیں گے۔

جو مہمان آتا ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ یا چینی کے پیکٹ اٹھائے شادی کی خوشیوں میں شریک ہو رہا تھا۔ سوچا ساری خود ہی کھائی جائے اور ایک ٹرنک میں ڈالتے گئے۔ شادی کو ہفتہ چھوڑ پندرہ دن گزر گئیے۔ ٹرنک سے بدبو آئی تو پتا چلا مٹھائی سڑ گئی۔ اوہو۔ افسوس

کیوں جی اتنی مہنگی پڑھائی کا بوجھ ہم نے اٹھایا ڈاکٹر بنے۔ کسی کا علاج مفت کرنا سخت بے وقوفی ہے۔

یہ سلائی کڑھائی میں بنا فیس کے کبھی نہ سکھاوں گی۔ لو اس طرح ہمارا کیا فائدہ ہو گا؟

گاڑی ہماری اپنی ہے۔ گھر کے سو کام اسی سے نکلتے ہیں۔ اب مارکیٹ جاتے ہوئے آس پڑوس بھی اپنی اپنی لسٹیں تھما دیں۔ کہاں کا انصاف ہے۔

ٹھیک ہے اپنے جسم میں بہت طاقت ہے بڑی بڑی چیزیں منٹوں میں یہاں سے اٹھا وہاں رکھنا کوئی مشکل کام نہیں اپنے لیے لیکن یہ کیا ایرے غیرے مدد مانگنے پہنچ جاتے ہیں۔ ان میں جان نہیں تو میں کیا کروں؟

یہ اور اس طرح کے کئی کردار اپنے ارد گرد نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت حال کبھی آپ کو پیش آئی؟؟؟

آپ نے کیا کِیا؟

☆☆☆☆☆